کلیاتِ شاذ
شاذ تمکنت

کُلّیاتِ شاذ تمکنت

کلّیاتِ شاذ تمکنت

شاذ تمکنت

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

نام کتاب	کُلیاتِ شاذؔ تمکنت
مصنّف	شاذؔ تمکنت
سرِورق	فواد تمکنت
سنِ اشاعت اوّل	۲۰۰۴ء
قیمت	۳۵۰ روپے
مطبع	راحیل نسیم پرنٹرس، دہلی۔٦

تعارف

نام	:	سیّد مصلح الدین
قلمی نام	:	شاذ تمکنت
پیدائش	:	۳۱/جنوری ۱۹۳۳ء حیدرآباد
وفات	:	۱۸/اگست ۱۹۸۵ء حیدرآباد
تعلیم	:	ایم اے، پی ایچ ڈی (عثمانیہ یونیورسٹی)
پیشہ	:	تدریس شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ
پہلا مجموعہ	:	تراشیدہ ۱۹۶۶ء
دوسرا مجموعہ	:	بیاضِ شام ۱۹۷۳ء
تیسرا مجموعہ	:	نیم خواب ۱۹۷۷ء
چوتھا مجموعہ	:	دستِ فرہاد ۱۹۹۴ء (بعد از مرگ)

(انتخاب کلام ورقِ انتخاب ۱۹۸۱ء حیدرآباد (انڈیا) اور کراچی پاکستان سے ایک ساتھ شائع ہوا)

☆☆

انتساب

شاذیہ کے نام—

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

○

''قانونِ باغبانیِٔ صحرا نوشتہ ایم''

○

فہرست

☆☆

پیش لفظ

شاذ تمکنت نے جب شعر کہنا شروع کیا، ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے عوامی مصنفین کا چولا بدلا تھا۔ سلیمان اریب اس کے سکریٹری تھے اور ماہنامہ "سب رس" مرتب کرتے تھے۔ پھر انھوں نے ماہنامہ "صبا" جاری کیا۔ شاذ تمکنت بھی انجمن عوامی مصنفین سے وابستہ ہوئے لیکن ترقی پسند تحریک کی ادعائیت سے دور رہے۔ انھوں نے اردو کی کلاسیکی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اپنے دور کے دو بڑے شاعروں جوش اور فراق سے اکتسابِ ہنر کیا اور بہت جلد اپنا منفرد طرزِ اظہار اختراع کرلیا۔

اپنے پہلے مجموعہ ء کلام تراشیدہ کے پیش نامے "لطفِ خلشِ پیکاں" میں انھوں نے اپنے نظریہ ء فن کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے:

"میں غمِ ذات اور غمِ کائنات کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں نہیں بانٹتا بلکہ میری دانست میں غمِ ذات عبارت ہوتا ہے، غمِ کائنات سے۔ ایک فرد کا غم اس کا اپنا ہوتے ہوئے بھی در پردہ افراد کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتا ہے۔ کائنات کے خارجی موضوعات بھی اس وقت تک کامیاب شعر کا جامہ نہیں پہن پاتے جب تک کہ اس میں شخصیت کا غمِ ذات کا پُٹ نہ ہو۔۔۔۔ میں شعر کسی پیغام کی خاطر یا درس دینے کے لیے نہیں کہتا۔ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ شعر ہو یا افسانہ اول اول فن کار اپنی تسکین کے لیے، اپنی انا کو سکون بخشنے کی خاطر تخلیق کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ متاعِ ہنر آخر آخر اتنی دل پذیر ہو جائے کہ شاعر اپنے پرائے اہلِ دہر کا قیاس کرے۔"
یہ پیش نامہ شاذ تمکنت کے نظریہ ء فن کے ساتھ ان کے تخلیقی رد یے کا مظہر ہے۔

شاذ تمکنت ایک نظم نگار شاعر کی حیثیت سے ابھرے لیکن جلد ہی منفرد غزل گو کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنالی۔ ابتدائی دور کی نظموں کی نمایاں خصوصیت مرصع مرقع نگاری

ہے۔ وہ اپنے جذبات و خیالات کو حسین اور دلکش پیکروں میں ڈھال دیتے ہیں۔ پیکر تراشی کے لیے انھوں نے تشبیہہ نگاری سے خاص کام لیا ہے۔ ان کی تشبیہوں میں خارجی فطرت مختلف کیفیات، جذبات اور مشاہدات کو اپنے دامن میں سمیٹے انوکھے انداز میں جلوہ ساماں نظر آتی ہے۔

بیش تر نظموں میں تشبیہی اور وصفی مرکبات ان کے اظہار کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ جیسے:

اوس کی آنچ سے پتیاں جل اُٹھیں
نرم کھرے کی ضو جھلملاتی رہے
(لذت سنگ)

اوس کی پیاس سے کھلتی ہوئی ہونٹوں کی کلی
رس سے چھلکی ہوئی باتوں کی چھنکتی جھانجھن
(نیند کی وادی میں)

لب بستہ فسردہ چاندنی میں
میداں کے سلگتے حاشیے پر
اک اونگھتے مقبرے کے اندر
آنسو کا چراغ جل رہا ہے
(کھنڈر)

جب کرن آتی ہے پابوسیِ شبنم کے لیے
جگمگا اٹھتے ہیں وجدان کی طاقوں کے دیے
(میرا فن، میری زندگی)

دیوارِ دل سے یاد کے
سائے اتر کر رہ گئے
موتی تری گفتار کے
چھن چھن بکھر کر رہ گئے
(ایک صبح)

تشبیہی مرکبات سے پیکر تراشی کا یہ انداز بعد کے دور کی شاعری میں کسی حد تک کم

ہو گیا اور اس کی جگہ اظہار کے نئے اسالیب برتے گئے۔ بیاضِ شام میں "بانس کا جنگل" ایک تمثیلی نظم ہے جس کا واحد متکلم عاشق خود کو بانس کے جنگل سے مشابہہ تصور کرتا ہے۔ اسی مجموعے کی ایک طویل نظم "طیور آوارہ" ہے جس میں شعور کی رو کی ٹکنیک کو بڑی فن کاری سے برتا گیا ہے۔ سوچ کی رو نیم شب گہری خموشی میں تنہائی کے غم سے شروع ہوتی ہے۔ پھر ریل کی سیٹی سنائی دیتی ہے، شاعر سوچتا ہے: خدا جانے کہاں جاتے ہیں لوگ / کیا یہ سچ ہے پھر پلٹ کر اپنے گھر آتے ہیں لوگ /۔ سوچ کی لہر شاعر کو شہرِ خموشاں میں لے جاتی ہے: / جانے کیسے لوگ تھے کیا خال و خط گم ہوگئے / شورِ دنیا کیا قیامت ہے یہ کیسے سوگئے /۔ شاعر پرانی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ صبح ہوتی ہے۔ کالج جاتا ہے۔

بس کا سفر، اخبار بیچنے والے کی آواز۔ جنگ کی خبریں۔ قتل و غارت گری کے منظر سامنے آتے ہیں۔ اور کئی خبریں۔ سوچتا ہے: / کب خدا جانے سکونِ دل کے لمحے آئیں گے /۔ بوڑھے رفوگر کا خیال آتا ہے: / روز و شب کرتا ہے جو کپڑوں کے زخموں کا حساب /، پھول چننے والی لڑکی کا خیال آتا ہے جو اس کے دل میں کانٹے بو گئی اور اب وہ زندگی سے جی کو یوں بہلاتا ہے / اون کی گڑیا کو جیسے بانجھ عورت تھپتھپائے / پھر ایک مسلسل گیت کی آواز۔ کشتی، بادبان اور پتوار۔ آگے مٹیالے نشیبوں سے پرے چرواہے بیلوں کو لیے جارہے ہیں، گویا صبح کاذب آگئی ہے اب صبح ہوگی اور / از سرِ نو پھر تعارف ہوگا سورج سے کہ میں / روز چہرے کو بدل لیتا ہوں جینے کے لیے /۔

"بیاضِ شام" میں ایک اور طویل نظم ہے: "مخدوم کی یاد میں" اس نظم میں بھی اظہار کا ایک انوکھا تجربہ کیا گیا ہے۔ مخدوم محی الدین کی وفات ایک سانحہ تو تھی لیکن کیسا سانحہ کہ جس سے دکن کی "بساطِ رقص" ہی الٹ گئی۔ اب ان لوگوں کا کیا ہوگا جو اپنا درد اس کے پاس لے کے آئے تھے۔ ان نوجوانوں کا کیا ہوگا جنھیں ادھورے خواب سونپ کر وہ چلا گیا۔

کھیت میں کام کرنے والی لڑکی جو ابھی اس کی چاپ اور آہٹیں سن رہی ہے اس کے خواب بھی ادھورے رہ گئے۔ اس کے آگے۔۔ شاعر، مخدوم کو سپردِ خاک کرنے کے بعد اپنے شدید غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی باتوں کو اور ان کی صفات کو یاد کرتا ہے: / تری مثال جیسے آبِ چشمہ رواں رہی / تو دوسروں کے رخ کی گرد دھوکے مطمئن رہا۔۔۔ تو فرد کب تھا بزم تھا،

حیات تیرے ساتھ تھی / زمانہ تیرے ساتھ ، کائنات تیرے ساتھ تھی /۔ اس کے آگے اپنے ذاتی تعلقات اور تجربات کو یاد کرتا ہے : وہ سیر چشمیاں تری / وہ محفلیں، وہ رت جگے، وہ جشن مے، وہ قہقہے / وہ یار باشیاں تری / تکلم شگفتہ و تبسم نگاہ میں / وہ دل نوازیاں تری /۔ اور آخر میں بہ حیثیت شاعر اس کی کمی کا احساس دلاتے ہوئے کہتا ہے : سجے گی یوں تو بارہا سخن کی انجمن یہاں /۔۔۔ مگر کلید رونق ہر انجمن تو کھو گئی / دکن کی قسمت سخن تو تیرے ساتھ سو گئی ۔ غرض یہ نظم ایک خاص انداز کا بے مثال مرثیہ ہے۔

ان کے مجموعہ ، کلام نیم خواب ، میں نظمیں کم ہیں۔ چند عشقیہ نظمیں ہیں جن میں فراق و وصال کی کیفیات کو خوب صورتی سے قلم بند کیا گیا ہے اور محبوب کے سراپا کے بیان میں تشبیہہ نگاری کا اسلوب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

روشنی چہرے پہ دیدار کی تقریب کی طرح
وہ نمو یافتہ قامت کسی تشبیب کی طرح
جسم کے خط ہیں کہ باریک قلم کی تحریر
صاف و شفاف کہ تقدیر رقم کی تحریر
(درد پذیرائی)

پلکیں نیندوں کے چنور، آنکھیں شبستاں کے چراغ
سخن زیر لبی ، مشک کے جھونکے جیسے
لفظ نو شینہ تو لہجہ ہے شکر قند کی طرح
جملے اس چاؤ سے پورے ہوں کہ وعدے جیسے
(دائرہ)

آنسو کی دھند ، یاد کے جگنو ، طویل سوچ
بیتے ہوئے دنوں کی جھلک یاد آ گئی
پیماں کی بیلیں پاؤں سے آکر لپٹ گئیں
وعدوں کے پھول بن کی مہک یاد آ گئی
(تجدید رسم و راہ)

مری آواز میں تھا ٹوٹتی راتوں کا سناٹا
مرے لہجے میں جیسے گھل رہی تھی میری تنہائی
شکستہ ہو رہی تھیں سیڑھیاں خوابیدہ لفظوں کی
معانی تھے سرِ بامِ سخن گویا تماشائی
(یاں نفس واں نکہتِ گل ہے)

یہ آدھی رات ، پورا چاند ، آنگن
رمِ آہو ، مری عمرِ گریزاں
یہ زخمِ آگہی ، یہ شورشِ جاں
یہ وجدانِ نظر ، ادراکِ گلشن
میں شبنم سے شرر کو چھو رہا ہوں
(آدھی رات، پورا چاند)

"دردِ پذیرائی" ایک انوکھی نظم ہے۔ محبوب کی قربت اور وصال، اس کا لطف و کرم اور نگاہ التفات حاصل ہونے کے بعد بھی عاشق ایک کرب میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ حسن کی خو بھی حزیں عشق کی فطرت بھی حزیں، اور / آگ سی آگ رگ و پے میں سمونا ہے ضرور / وہ کرم ہو کہ ستم عشق میں رونا ہے ضرور / شاعر کہتا ہے کہ اس کا عشق عشقیہ شاعری کی عام روایت سے مختلف ہے۔ اس کے عشق میں رقیب کا گزر نہیں۔ اس نظم میں محبوبہ کا بڑا ہی دل کش سراپا قصیدے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کی تشبیہ نگاری بھی خوب ہے۔

نظم "بیداد" اظہار کا نیا تجربہ ہے۔ اس میں ایمائیت کا کمال ہے اور ڈرامائیت کی شان بھی۔ نظم کا آغاز اس ڈرامائی منظر سے ہوتا ہے: شام کے رنگ میں گھل جاتے ہیں گہرے سائے / پاس کے پیڑ سے گرتے ہیں سنہری پتے / راہ گیروں کے قدم پڑتے ہیں / میرے احساس میں کہرام سا مچ جاتا ہے / زرد پتوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں میں / وہ مجھے روک تی ہے / اس نظم میں زینو (محبوبہ) کا غیر روایتی کردار پیش کیا گیا ہے جو عاشق کی بے مہری کا شکار ہے۔

عاشق کے فراق میں اس کی جو حالت ہے وہ ناسی سس کی عاشق "گونج" (Echo) کی

یاد دلاتی ہے۔ وہ ناسی سسس کے فراق میں گھل کر صرف آواز رہ گئی تھی۔ ایسا ہی کچھ حال زینو کا ہوا: / یوں چھٹی مانگ سے افشاں اس کی: جس طرح پھول سے زیرہ جھڑ جائے / رات بھر جاگتی رہتی ہے ستاروں کی طرح / موم بتی کی طرح روتی ہے /۔ زینو کی یہ حالت دیکھ کر عاشق کی آنکھیں نم آلود ہیں لیکن دل میں ایک پر غرور مسرت بھی ہے اس بات کی کہ / لو چلو آج یہ دن بھی آیا / ناز اٹھوانے کا ارماں نکلا / چاہے جانے کی تمنا نکلی /۔

ٹائم کیپسول شاذ تمکنت کے عام رنگ سے ہٹی ہوئی ایک فکر انگیز طویل طنزیہ نظم ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے مورخ، قوموں کی زندگی کے اصل حالات کو کس طرح مسخ کر کے پیش کرتے ہیں مورخ ہی کی زبانی بیان کیا گیا ہے: / تضاداتِ دیر و حرم کو چھپا کر مفاداتِ دیر و حرم لکھ رہے ہیں / صنم کو خدا، مصلحت کہہ رہی ہے، خدا کو بنامِ صنم لکھ رہے / ۔۔۔ فسانہ طرازی ہے تاریخ گویا کہ گردوں کو زیرِ قدم لکھ رہے ہیں /۔ دوسرے باب میں تقسیمِ ہند کے سانحے کو ایک خوش گوار حادثے کا رنگ دیا گیا۔ افرنگ کا منصوبہ تھا کہ فسادات ہوں، خون کے دریا بہیں لیکن اس کے برعکس ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو گلے لگا کر بادیدہ ، پرُ نم رخصت کرتے ہیں۔ تیسرے باب میں مہاتما گاندھی کی شہادت کو شادیِ مرگ ٹھہرایا ہے۔ پانچ ہزار سال بعد ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ قاری جب تاریخ کے اوراق الٹتا ہے تو اسے ماضی میں اپنے وطن کی ایک دل خوش کن تصویر دکھائی دیتی ہے: / شہد کے دھارے رواں تھے دودھ کی نہروں کے بیچ / نقرئی رستے طلائی حاشیے کندن کے پیڑ / ۔۔۔ خیر کے میداں میں اک دن شر نے بازی ہار دی / اور پھر چاروں طرف سے بن برستا ہی گیا / ۔۔۔ / سیر چشمی ، آشتی آسودگی، زندہ دلی / مذہبی بنیاد پر رسمِ عداوت ہی نہ تھی / سنکھ مسجد میں بجاتے تھے برہمن رات بھر، اور مندر میں اذانوں پر موذن رات بھر / ۔۔۔ اس دور کے ہندوستان میں یوں تو کئی زبانیں تھیں لیکن / ایک اردو تھی کہ جس کا بول بالا تھا بہت، ناز سے پالی گئی جمہوریت کے دور میں / اس کے شاعر تھے بہت آسودہ حال اور مطمئن / ۔۔۔ لیکن تاریخ کے اس حصارِ سنگ سے آگے: ادھر زمیں کی تہوں کے نیچے دھرا ہے تابوت آگہی کا ، فضا میں ہیں کسمساہٹیں سی، شکستہ لفظوں کی آہٹیں سی / تمام الفاظ چل رہے ہیں، کفن سے باہر نکل رہے ہیں / اب لفظ اپنے اطراف کے نظارے سے پشیماں اور خوف زدہ ہیں وہ دیکھتے ہیں: / پھٹا پرانا ادھورا بستر، کھنکتے ڈبے،

شکستہ برتن، فسردہ بچے، دریدہ چادر / اور ۔ ۔ ۔ / سنہرے کھیتوں میں پھن کھڑے ہیں، ترازو پاسنگ سے جھکے ہیں، ملوں کے نالے کراہتے ہیں / اس طرح پریشاں حال الفاظ اندھیرے رستوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں اور اپنا مفہوم تلاش کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی موثر نظم شاذ تمکنت کو ایک باکمال طنز نگار کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔

مجموعہ کلام "دستِ فرہاد" میں شاذ تمکنت کی نظم نگاری نے چولا بدلا اس مجموعے کی اکثر نظمیں بیانیہ ہیں جن میں خیالات کو نظم کر دیا گیا ہے۔ سماجی اور سیاسی حالات پر براہ راست تنقید کی گئی ہے۔ "چھوٹا آدمی، ایک سوچ، ایک سوال، کہرام، ہم لوگ، خدا ترس، سفید لہو، اور اکائی، اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

نظم نگاری میں شاذ تمکنت نے جہاں اپنی انفرادیت کا پرچم لہرادیا وہیں غزل کو بھی نیا رنگ دیا۔ غزل میں جہاں جہاں انھوں نے ہجر و فراق کی کیفیات کو رقم کیا ہے ان کے شعر دلوں کو چھو لیتے ہیں۔ ایک درد انگیز غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جانے والے تجھے کب دیکھ سکوں بار دگر
روشنی آنکھوں کی بہہ جائے گی آنسو بن کر
رو رہا ہوں کہ ترے ساتھ ہنسا تھا برسوں
ہنس رہا ہوں کہ کوئی دیکھ نہ لے دیدہ تر
میں نے ہر رات یہی سوچ کے آنسو پونچھے
منھ دکھانا بھی ہے دنیا کو بہ ہنگامِ سحر

اور یہ شعر:

ترے خیال سے رگ رگ دکھی ہوئی ہے مری
عجب طرح کی کمی رہ گئی ہے جینے میں

وہ لوگ جو تجھے ہر روز دیکھتے ہوں گے
انھیں خبر نہیں کیا شے ہے حسرتِ دیدار

شب و روز جیسے ٹھہر گئے کوئی ناز ہے نہ نیاز ہے
ترے ہجر میں یہ پتا چلا مری عمر کتنی دراز ہے

ہر محفلِ نشاط سے پھرتا ہوں دور دور
کیا احتیاط ہے کہ ترا غم بہل نہ جائے

جاتے جاتے اس نے کیا وسعتیں عطا کی ہیں
جس طرف نظر ڈالوں دشتِ بے کراں دیکھوں

بھٹک رہا ہوں کہ فردا کا راستہ گم ہے
قدم قدم مرا ماضی ہے میرے حال کے ساتھ

آج کھولا تھا درِ خانۂ دل
ایک بھی چیز سلامت نہ ملی

چراتا پھر رہا ہوں اپنی آنکھیں غمگساروں سے
کچھ ایسا لگ رہا ہے مجھ کو جھوٹا کر دیا تو نے

فراق و ہجر کے علاوہ کئی کیفیات و معاملات عشق ہیں جنھیں شاذ تمکنت نے نہایت نازک خیالی کے ساتھ غزل کے اشعار میں سمویا ہے:

ایک رات آپ نے امید پہ کیا رکھا ہے
آج تک ہم نے چراغوں کو جلا رکھا ہے

صرف آواز سنانے کی ادا
کون سمجھے گا دلاسا کیا تھا

تیرا لہجہ ہے کہ سناٹے نے آنکھیں کھولیں
تیری آواز کلیدِ درِ تنہائی ہے

روز وحشت کا تقاضا ہے کہ صحرا کو چلیں
روز اپنے آپ کو زنجیر پہناتے ہیں ہم

ترے بغیر زمانے کو منہ دکھا نہ سکوں
یہ زندگی کہیں شرمندگی نہ بن جائے

ہم شہرِ تمنا کے دروازے سے لوٹ آئے
اللہ رے سناٹا ، اللہ رے خاموشی

یہ جہاں ہے محبسِ بے اماں کوئی سانس لے تو بھلا کہاں
ترا حسن آگیا درمیاں ، یہی زندگی کا جواز ہے

پیاسا ہوں ریگ زار میں دریا دکھائی دے
جو حال پوچھ لے وہ مسیحا دکھائی دے

اک خوف ہے کہ منزلِ نسیاں قریب ہے
تو وادیِ خیال سے آگے نکل نہ جائے

میرا اور دنیا کا پھر سے معرکہ ٹھہرے
میں ترے تبسم کی صلح درمیاں دیکھوں

اس نے دوری کی بھی حد کھینچ رکھی ہے گویا
کچھ خیالات سے آگے مجھے جانے نہ دیا

لو دے رہی ہے سوچ کے وقفے کی خامشی
ہر بات کا جواب سنبھل کر مجھے نہ دو

اس کا ہونا ہی بھری بزم میں ہے وجہِ سکوں
کچھ نہ بولے بھی تو وہ میرا طرف دار لگے

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ شاذ کی غزل روایت کی پاس دار ہوتے ہوئے بھی غیر روایتی ہے اور اپنے ہم عصر شعرا کی غزل گوئی سے بھی مختلف ہے۔ شاذ تمکنت نے غزل کے روایتی مضامین نہیں باندھے ہیں اور روایتی استعاروں کو روایتی تلازموں کے ساتھ بھی نہیں برتا ہے۔ ان کی غزل میں قافیے کے سہارے مضمون باندھنے کی کوشش بھی نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ نظموں میں جس انداز کی تشبیہی مرقع نگاری کی ہے غزل میں یہ انداز کم کم ہی نظر آتا ہے۔

نظم اور غزل کے علاوہ شاذ تمکنت نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے غالب اور اقبال کی غزلوں کی تضمینیں لکھیں۔ یہ تضمینیں اصل غزلوں سے اتنی مربوط اور ہم آہنگ ہیں کہ کہیں پیوند کاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ شاذ تمکنت کے ذخیرہ، کلام میں قطعات ،گیت ،نعت اور مناجات بھی شامل ہیں۔ ان کی مناجات "کب تک میرے مولا" بے حد مقبول ہوئی اور سماع کی محفلوں میں سامعین پر وجد طاری کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان کی نعت "آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا" دلوں کو گداز بخشتی ہے۔ شاذ تمکنت کا گیت "موج دساحل سے ملو" نہایت نغمہ نواز اور دل کش ہے اور موسیقی کی محفلوں میں جان پیدا کر دیتا ہے۔

شاذ تمکنت کی تخلیقات کے اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوگا کہ وہ ایک بے مثال شاعر تھے۔ لفظوں کے انتخاب اور ان کی باہمی ترکیب سے انھوں نے اپنے فن کی ایک نئی دنیا آباد کی۔ وہ اپنے فن سے یوں خطاب کرتے ہیں:

تیرے قصرِ طرب آہنگ کو ہو اس کی خبر
کہ ہر اک خشت میں پنہاں ہے مرا دردِ ہنر

- - - - - -

عقدہ ، خاطرِ ہر سنگ کھلا ہے مجھ پر
غرفہ ، منظرِ صد رنگ کھلا ہے مجھ پر

- - - - - -

عکسِ ہر منظرِ جاں تاب اتارا میں نے
یوں نکھارا ترے فانوس کی دیوار کا رنگ

- - - - - -

رفعتِ فکر کی منزل پہ پہنچ کر اکثر
کتنے نادیدہ جہانوں کو صدا دی میں نے
کتنے نوخیز عناصر کو بہ عنوانِ نمو
اپنے افکار کے دامن کی ہوا دی میں نے

- - - - - -

تھہ لوح و قلم نے ترا ہر پیکرِ نقش
اتنی محنت سے تراشا ہے کہ جی جانتا ہے
ہر بنِ مو کو زباں دی مگر اس ارماں نے
اس قدر خون رلایا ہے کہ جی جانتا ہے
اپنا سرمایہ ، جاں تجھ پہ بہ صد حسنِ خلوص
بے دریغ اتنا لٹایا ہے کہ جی جانتا ہے

○●○

۳۱ / دسمبر ۲۰۰۳ء

مغنی تبسم
6-3-659 # سوماجی گوڑہ،
حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲ (اے پی)

تراشیدہ

ترتیب

غزلیں

☆☆

لُطفِ خَلشِ پیکاں

نخچیرِ محبت کا قصہ نہیں طولانی
لُطفِ خلشِ پیکاں، آسودگیٔ فتراک

صیغۂ واحد مُتکلم یوُں بھی اظہارِ انا کا ایک وسیلہ ہے اور پھر اپنے ہی فن کے بارے میں کچھ کہنا، اِس کی ساخت پرداخت اور ارتقا کے عناصرِ ترکیبی کا جائزہ لینا ایک دُشوار گزار مَرحلہ ہے۔ ان چند نظموں اور غزلوں کی مثال میری اپنی ذہنی اور رُوحانی سوانح عُمریوں کی سی ہے جن کے ذریعہ میری داخلی اور خارجی زندگی اور اُس کے مظاہر کی نقاب کُشائی ہوتی ہے۔ شعر میں بہت سی باتیں اُڑتی ہوئی تِتلیوں کی مانند ہوتی ہیں جنھیں چھو لیں تو رنگ چھوٹنے لگیں ـــــ لیکن شعر کے کُنج میں یہ تِتلیاں آزادانہ گھُومتی پھرتی ہیں۔ مختلف نظموں اور غزلوں کی تحریک و تخلیق کے بارے میں لکھنا، جہاں قارئین کی دِلچسپی کا سبب بن سکتا ہے، وہاں میرے لیئے یہ تجزیہ قیامت آفریں بھی ہے۔ اِس مجموعہ میں بعض ایسی نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں جنھیں کہتے ہوئے مجھے ہوش نہ تھا کہ یہ میری داخلی اور جذباتی زندگی کی اُداس یادیں بن جائیں گی۔

یہ چند نظمیں اور غزلیں جو آپ کی نظروں کے آگے ہیں، میرے ماحول کی داخلی اور خارجی کیفیات سے لَو دے رہی ہیں۔ یہ شعر غمِ ذات اور غمِ کائنات کی شاعرانہ تفسیریں ہیں۔ میں غمِ ذات اور غمِ کائنات کو علٰحدہ علٰحدہ خانوں میں نہیں بانٹتا، بلکہ میری دانست میں غمِ ذات عبارت ہوتا ہے غمِ کائنات سے۔ ایک فرد کا غم اُس کا اپنا ہوتے ہوئے بھی دَرپردہ اَفراد کے دُکھ سُکھ کی ترجمانی کرتا ہے۔ کائنات کے خارجی موضوعات بھی اُس وقت تک کامیاب شعر کا جامہ نہیں پہن پاتے جب تک اُس میں شخصیت یا غمِ ذات کا پُٹ نہ ہو۔ اکثر خارجی نظمیں محض پروپیگنڈہ یا لایعنی وَعظ اِس لیئے معلوم ہوتی ہیں کہ اُن میں شاعر کی شخصیت یا تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی

جتی ہے تو تماشائی کی سی ــــــ اس طرح نظم یا غزل اپنا تاثر چھوڑے بغیر ذہن سے
محو ہو جاتی ہے۔ میرا ایقان ہے کہ سچّا ادیب و شاعر وہی ہے جو اپنے جذبات کی
زیریں آنچ سے تپ کر تخلیق کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو۔ موضوع بالذات حقیر یا
عظیم نہیں ہوتا، وہ تو لکھنے والا ہر ہر لفظ کے پیچھے جلوہ گر رہتا ہے جس سے شِدتِ
احساس، تفکر اور اظہارِ بیان کی قدریں متعین ہوتی ہیں۔

مَیں شعر کسی پیغام کی خاطر یا درس دینے کے لیئے نہیں کہتا بلکہ اِس لیئے کہتا
ہوں کہ کچھ باتیں جَلوت میں ممکن نہیں ہوتیں اِس لیئے خلوت کے اِنتخاب کو ناگُزیر
جانتا ہوں، اگر کوئی شاعر جو تشکیل و تعمیر کے مَرحلے میں ہو اور وہ یہ کہتا ہو کہ وہ شعر کے
ذریعہ محض اصلاحِ مُلک و قوم کرتا ہے تو مجھے یہ دعویٰ ماننے میں تامّل ہوگا۔ دیانت
داری کی بات یہ ہے کہ شعر ہو یا افسانہ اوّل اوّل فنکار اپنی تسکین کے لیئے، اپنی
انا کو سکون بخشنے کی خاطر تخلیق کرتا ہے، یہ بھی عَین ممکن ہے کہ یہ متاعِ ہُنر آخر آخر اتنی
دِل پذیر ہو جائے کہ شاعر اپنے پر اہلِ دَہر کا قیاس کرے۔

اِن چند سطروں کی نوعیت اعتذار و اعتراف کی سی ہے کہ ؎

صَد حَیف کہ تُرش ہو گیا شہدِ خیال
الفاظ کی بوتلوں میں آتے آتے

برادرم امتیاز اس مجموعہ کی اشاعت میں میرے دستِ راست بنے رہے۔
مُحبانِ عزیز مُصحف اقبال توصیفی، ہادی رحیل اور بشیر انور کا ممنون ہوں جنھوں نے
ازراہِ خلوص تعاونِ عمل فرمایا ہے۔

میر اعظم علی ــــــ پرنٹر، پبلشر، ایم۔ اے غفار آرٹسٹ اور محمد عبدالسلام
خوشنویس نے 'تراشیدہ' کی صُورت گری میں جس محبت اور محنت کا ثبوت دیا ہے، اُس
کے لیئے میں سَراپا سپاس ہوں۔

شاذ تمکنت
۶۸۷۔ معظم پورہ
حیدرآباد (آندھرا پردیش)

☆☆

لذّتِ سنگ

رات سُنسان ہو زَرد رُو چاندنی
سبز شیشوں سے چھن چھن کے آتی رہے
اوس کی آنچ سے پتّیاں جل اُٹھیں
نَرم نُکھرے کی ضَو جِھلملاتی رہے
ایک چُپ کا سماں ہو زمیں تا فلک
خامشی لوریاں سی سُناتی رہے
ایسی ہی رات ہو، اَن کہی بات ہو
چاند ہو زَرد کرنوں کی برسات ہو
میں بچھڑ جاؤں تم سے بہ عذرِ سفر
طاق پر شمع آنسو بہاتی رہے

O

اور مَیں اَجنبی دَشت و دَر میں پھروں
کوئی مُجھ سے نہ پُوچھے کہ میں کون ہوں
پاؤں کی گرد کہہ دے مسافر ہوں مَیں
ایک تصویر ہوں ایک پتھر ہوں مَیں
راہ چلتے سفر میں اگر شب پڑے
آسماں نیلگوں سائباں تان دے
صبح سورج جگادے کرن بھیج کر

لکّۂ ابرِ آوارہ سایہ کرے
جھیل کا جھِل جھِلاتا ہوا آئینہ
مجھ کو یاد اپنا چہرہ دِلاتا رہے
میں وہی ہوں جسے رَاس آتی نہیں
قرب پائندگی، وصل آسودگی
جو تمہیں چھوڑ کر چَل پڑا ہو کہیں
جس نے سوچا نہیں تنگ ہے یہ زمیں

O

دِن مہینوں میں تبدیل ہو جائیں گے
جب کڑی دُھوپ کے تشنہ لمحات میں
سائے چھتنار پیڑوں کے کھو جائیں گے
رفتہ رفتہ مجھے یاد آؤ گی تُم!

O

سوزنِ خار سے پاؤں کے آبلے
پھُوٹ کر خُونِ تازہ میں نہلائیں گے
آپڑیں گے جَراحت کے جب مَرحلے
رفتہ رفتہ مجھے یاد آؤ گی تم!
جب سَرِ شام میداں سُلگنے لگے
اُڑ کے طائر چلیں آشیاں کی طرف
چہچہاتے ہوئے پَر بہ پَر صَف بہ صَف
گُونجتی گنگناتی ہوئی ڈار سے
پیچھے رَہ جائے تھک کر پرندہ کوئی
دُور چمکے اکیلا ستارہ کوئی
رفتہ رفتہ مجھے یاد آؤ گی تُم!

O

دن مہینوں میں تبدیل ہو جائیں گے
جانے مَیں کس طرح یاد آؤں تمہیں
یہ نہ ہو کونے کونے رُلاؤں تمہیں
جب بھی بالوں میں کنگھی اُلجھ جائے گی
جب بھی آنکھوں کو کاجَل سے خوف آئے گا
بات ہم جولیوں کی بھی بَرمائے گی
میں تَسلّی کے مانند یاد آؤں گا

O

کوئی ہمراز چنچل حسینہ تمہیں
دے گی آواز جب نام کو توڑ کر
تم کسی شمعِ طوفاں زَدہ کی طرح
اپنے آنسو چُھپا لوگی مُنہ موڑ کر
مَیں گھٹا بَن کے آنکھوں میں چھا جاؤں گا

O

یوں بھی ہوگا کہ بوندوں کی رُت میں کبھی
مینہہ برسنے سے پہلے کی آندھی چلے
گھر کے رہ جاؤ تم گوشۂ کُنج میں
کنکری سی کوئی آنکھ میں جا پڑے
اور میں بے سَبب یاد آؤں تمہیں
رِیزۂ خاک بَن کر رُلاؤں تمہیں

O

اَدھ پکے پھَل ٹپک جائیں گے پیڑ سے
بور جھڑ جائے گا اکھوے کمھلائیں گے
شاخ جھولے گی از خود چٹخ جائے گی

پیچ رُتی کے بَرکھا میں جَل جائیں گے
اَبر کے صفحۂ سُرمگیں پر تمھیں
میرے لکھے ہوئے گیت یاد آئیں گے

O

یوں بھی محسوس ہوگا تمھیں پچھلی شب
میرے نقشِ قدم چل رہے ہیں کہیں
کوئی بَرچھائیں سی سنگِ دہلیز پر
کانپتا ہاتھ زنجیرِ دَر کے قریں
دِن مہینوں میں تبدیل ہوجائیں گے

O

اور آئے گی پھر وہ سُہانی سحر
میں تمہاری طرف یوں پلٹ آؤں گا
چار سُو جیسے اعجاز آرائی ہے
گیند اُچھالی ہوئی عرصۂ خواب کی
بَن کے تعبیرِ بیدار لوٹ آئی ہے

O

میں تمہاری طرف یوں پلٹ آؤں گا
جیسے گونجی ہوئی کوئی آواز تھا
لَب سے نکلا مگر راز ہی راز تھا

O

مَیں تمہاری طرف یوں پلٹ آؤں گا
جیسے بادل کا دَل سُوئے دَریا چلے
جیسے گوکل میں بنسی کا لہرا چلے
دُھن میں قامت کی جس طرح سایا چلے

موج آواز دے اور کنارا چلے
مَیں تمہاری طرف یوں پلٹ آوٗں گا

O

جانِ شاعر، تصوّر کا یہ شہر بھی
سَربسَر لُطف ہے سَربسَر قہر بھی
کچھ خبَر ہے تمہیں اے بہشتِ نظر
یہ محبّت بھی عادت سی کیوں بَن گئی
یہ وَفَا کا چلن جیسے بیگار ہے
دِلبَری بھی مرُوّت سی کیوں بَن گئی
لَذّتِ قُرب و دیدار و گفتار بھی
اک بے کیف راحت سی کیوں بَن گئی
کوئی پرَخاش تک روز و شب سے نہیں
زندگانی اِطاعت سی کیوں بَن گئی
سوچتا ہوں یہی بِنتِ شمس و قمر
میں بچھڑ جاؤں تم سے بہ عُذرِ سفر
بَزم گہرے کی ضَو جھلملاتی رہے!
طَاق پر شمع آنسو بَہاتی رہے!

☆☆

نیند کی وادی میں

نیند کے کُنج میں یادوں کے شگوفے چٹکے
کانچ کی نیلگوں چادر پہ یہ کچے موتی
کون در آئی رگِ گُل کا شلوکا پہنے
خواب کے کھیتوں میں نیلم کے نگینے بوتی

O

سیپ کی پوریں، ہتھیلی کی مُصفّا چاندی
پاؤں میں چھاگلیں تاروں کی جبیں پر مہتاب
زُلفیں بَل کھائی ہوئی بیوگ کی مچلی ہوئی رین
صَندلیں باہوں کا بلّور، مژہ، پارۂ خواب
اوس کی پیاس سے کِھلتی ہوئی ہونٹوں کی کلی
رَس سے چھلکی ہوئی باتوں کی چھنکتی جھانجھن
دَہکے دَہکے ہوئے رخساروں کے مہکے گُہرے
آنکھ کی جوت میں ہے قوسِ قزح کا روغن

O

ہر بُنِ مُو سے چھلکتی ہوئی سَیّال آنچیں
رَم رَس ہونٹوں کا، قامت کا گلابی لہراؤ
مانگ کے سونے میں ہے کاہکشاں کی زنجیر
دِل کے رَمنوں میں ہے شبنم کا خنک چھڑکاؤ

O

ٹھنڈکیں پچھلے پہر سینے میں لہرانے لگیں
چاند کی اوک سے چھلکا ہے سُنہرا پانی
گندنی چہرے سے پو پھوٹتی ہے نیندوں میں
جھلملاتی ہے شعاعوں کی سُبک پیشانی

☆☆

منظر و پس منظر

چمکتی دُوب کے فرشِ زمرّدیں کی آنچ
دہکتے نجمِ سحر کی طلائی نوکِ مژہ
رسیلی صُبحوں کے ہونٹوں کی بھینی بھینی شگندھ
مہکتے باغوں کی میٹھی گھنی گھنی چھاؤں
یہ وہ حسین مناظر ہیں، جن کی رعنائی
لُبھائے دِل کو، اگر نان و آب کا نشہ
بقدرِ شوق نگاہوں میں رقص فرمائے

☆☆

یاد

چاندنی راتوں میں پیڑوں کا گھنیرا سایا
پو پھٹے دور سے مسجد کی اذاں کا لہرا
ڈوبتی شام چراغوں کا جل اٹھنا کم کم
بھیگے بھیگے ہوئے برسات کے گہرے بادل
نیم خوابی میں برستے ہوئے پانی کی صدا
دور میدانوں میں گم ہوتی ہوئی پگڈنڈی
لو سے تپتی ہوئی ویران کوئی راہ گذر
سوکھے سوکھے ہوئے جھڑتے ہوئے پتوں کی کراہ
گھر کی دیوار پہ بیٹھی ہوئی چڑیوں کی چہک

○

یہ وہ منظر ہیں جنھیں تجھ سے علاقہ تو نہیں
میں نے ان میں بھی تری یاد کی ٹیسیں بھر دیں

☆☆

نارسا

چاند کے عکس کی پانی میں طِلائی پھانکیں
جس طرح آئینہ میں ہیرے کی کنیاں چمکیں
نیلمیں پانی کے بہتے ہوئے پتلے فیتے
نیند کے ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے جیسے
گھنے جنگل کہ جہاں خواب نمو پاتے ہیں
وہ ہوائیں کہ فرشتوں کے قدم آتے ہیں
کون سمجھے گا کہ اِس منظرِ فطرت کا سبھاؤ
اور دہکاتا ہے بھولی ہوئی یادوں کا الاؤ
فاختاؤں کی صدائیں جو چلی آتی ہیں
میری تنہائیاں سوچوں سے لپٹ جاتی ہیں
تتلیاں اُڑتی ہیں جس طرح شفق کے ٹکڑے
بھونرے گاتے ہوئے کاجل کی قبائیں پہنے
رقص کرتی ہوئی چڑیوں کے سُہانے دوہے
ان کی گونجوں پہ گُماں ہوتا ہے غم خواری کا
دیدنی ہے یہ سماں دِل کی طرح داری کا

O

کِتنے تلخاب اُتارے ہیں تہِ کام و دہن
کِتنے صحراؤں کی پہنائیاں کاٹیں مَیں نے
مُدتوں بعد کھُلا ہے یہ سلگتا ہوا راز
رونقیں بوئی تھیں تنہائیاں کاٹیں میں نے

☆☆

تشنگی

شب کی مدّھم تھکی آواز
خاطرِ جورِ ہست و بُود گداز

کتنے اشکوں کی گوٹ ٹانکے ہوئے
چاندنی کا اُداس اُداس آنچل
چاند یوں لُنج مُنج شاخوں میں
جیسے آویزاں ہو طِلسمی پھَل
حسرتوں کے سُفید رنگوں سے
چھلکی چھلکی ہوئی ہے چرخ کی ناند
بکھرے بکھرے ہیں اِسطرح تارے
ریزہ ریزہ ہوا ہو جیسے چاند

نیم شب کی رُندھی رُندھی چیخیں
کتنے تابوت اُٹھاتی ہیں دِل میں
زخمۂ سازِ آخرِ شب سے
گرتی جاتی ہیں خُون کی بُوندیں

O

دِل کی حسرت نے کیوں خُدا جانے
بے سبب تیرے نازِ غم جھیلے
جس طرح کوئی طِفلک معصوم
اپنے سائے سے آپ ہی کھیلے

☆☆

کھنڈر

سہمی ہوئی رات کا جزیرہ
سناٹے کی چیخ سُن رہا ہے
مہتاب کا دِل فگار کنگرہ
خاموشی کی لَو سے جَل اُٹھا ہے
تاروں کا اُداس اُداس جرگہ
تھک ہار کے جیسے لُٹ گیا ہے

O

لَب بستہ فسُردہ چاندنی میں
میداں کے سُلگتے حاشیئے پر
اِک اُونگھتے مقبرے کے اندر
آنسو کا چراغ جَل رہا ہے
محرابِ شکستِ آرزُو میں
ٹُوٹے ہوئے خواب سو رہے ہیں
سُوکھے ہوئے اِلتفات کے برگ
چُپ چاپ پڑے کراہتے ہیں
ٹُوٹی ہے سپُردگی کی چھاگل
بکھری ہیں ہر ایک سَمت کڑیاں
اِک چہرے کی دُھوپ بام و دَر سے
کہتی ہے حدیثِ شامِ ہجراں

ہے بابِ اثر پہ عالمِ ہُو
زخمی ہیں دُعا کے دست و بازُو

O

اِستادہ ہے پاس ایک کتبہ
تحریر یہ مرتسم ہے جس پر
اللہ کرے کسی کا سہرا
تا شامِ اَبد مہکتا جائے،
گُوندھے ہیں کسی نے زخم کے پھُول

☆☆

شبِ گداز

گلوئے شب میں یہ لَو دیتا چاند کا ہالہ
نیازِ عشق کا بشکستہ آستاں تو نہیں
عذارِ انجم پہ خوابیدہ نُقرئی غازہ
مآلِ خونِ تمنا کی داستاں تو نہیں
یہ قلبِ زار کہیں راندۂ جہاں تو نہیں
کنارِ چرخ میں آزردہ سوچتے بادل
سفینۂ نگہ و دل کے بادباں تو نہیں
فضا اڑاتی ہے گہرے کے رمسے آنچل
چھنک رہی ہے خلا میں سکوت کی چھاگل

O

ہنوز بام و درِ خاطرِ شکستہ میں
بسی ہوئی ہے گلِ التفات کی مہکار
کسی کی نرم نگاہی کی سُر مگیں کرنیں
نکھارتی ہیں مرے آنسوؤں کا رُوپ سنگھار
میں ایک عمر سے ہوں سازِ درد کی جھنکار
گلال رُخ کا، قبا کی تراش، جسم کا راگ
نظر کے جھومتے بجرے کے احمریں پتوار
جبینِ تُرکِ تمنا کا لُٹ گیا ہے سہاگ
یہ کِس کے عشق میں کھیلا ہے دل نے خوں سے پھاگ

☆☆

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو!

یہ نرم اُداس رُت خزاں کی
شاخوں میں ہوائیں کھو گئی ہیں
نیموں کی ہمکتی ٹہنیوں سے
نمکولیاں پک کے جھڑ چکی ہیں
دہلیزِ خزاں پہ چپکے چپکے
پُروا کے ہلورے رو رہے ہیں
بَرگد کے مُشن برِیدہ گیسو
شانے کو ترس ترس گئے ہیں
کلیوں کا مزار بن گئی ہے
شبنم کی سجل، لچکتی چلمن
ہر بُرگ تیاگی بَن چکا ہے
دکھلا گئی چھب خزاں کی جوگن

O

میں سوچ رہا ہوں مدّتوں سے
اے آنسوؤ! تم گواہ رہنا
اُس حُسن کے خال و خط کا نغمہ
کِس وادیٔ غم میں کھو گیا ہے

O

آنکھوں میں ہے خواب گاہ اُس کی
کھڑکی کی جَبیں پہ سبز بیلیں
کیا آج بھی پاسبان ہوں گی
کیا آج بھی اِک لجیلی ٹہنی
شیشوں سے ٹِھٹک کے جھانکتی ہے

O

وہ صحن کے ننھے ننھے پودے
وہ گود کے پالے کیاریوں کی
چھتنار کی ٹھنڈکیں لُٹاتے
اب جھوم کے گُنگناتے ہوں گے

O

میں اجنبی رَاہ پر کھڑا ہوں
ماضی کے کھنڈر کو تک رہا ہوں
مَلبے کے دُھویں کی زُلفِ پُر خم
ہر سَانس کے ساتھ گُوندھتا ہوں

O

اے بادِ خزاں کے نَرم جھونکو
ایوانِ نگار تک پہنچ کر
چوکھٹ پہ لُٹا کے میرے آنسو
اُس جانِ وَفا سے اِتنا کہنا
بوئے تھے جو اِنبساط کے بیج
اب اَشک کی فصل بَن گئے ہیں

O

جب پیڑوں کی چھتریوں سے گزرو
شاخوں سے مرا سلام کہنا
چڑیوں کی ملیں گی تم کو چہکیں
کہنا کہ وہ مطربِ فسردہ
مضراب کی چوٹ کھا چکا ہے
خود اپنے لہو میں بہہ رہا ہے

O

جب گزرو گے صحن و بام و در سے
کچھ زخمی صدائیں پاس آکر
پوچھیں گی مری تباہ حالی
تم اُن کو گلے لگا کے کہنا
مَیں سازِ سکوت بن گیا ہوں
آہوں سے نباہ کر رہا ہوں

O

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
اُس پیکرِ حُسن کی قبا کا
مہکار لیئے طواف کرنا
اُن آنکھوں کی پُر سکون جھیلیں
کب جانتی ہیں اتھاہ اپنی
ظلماتِ سحر کو کیا خبر ہے
کیا شئے ہے متاعِ آبِ حیواں
وہ لب کہ خیالِ شیشہ سازاں
رُخسار کہ بالشِ قمر ہے

O

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
جب زُلف کے بَن میں سنسناؤ
افشاں کے مِلیں گے تم کو جگنو
وہ مانگ کہ کہکشاں کا لچکا
وہ مانگ کہ ہے شفق کا فِیتہ
اُس مانگ کے دیپ سے یہ کہنا
تُم پوَ کی حِنائی راگنی ہو
مَیں صُبح کا تارہ بَن گیا ہوں
آنکھوں میں، تمہاری دِید کی پیاس
کس دَرد سے لے کے ڈوبتا ہوں

O

پھر تم کو ملے گی دِل کی سَرحد
آہستہ گُزرنا اِس جہاں سے
یہ کانچ کا قصرِ قرمزی ہے
یہ سیج شفق کے پھول کی ہے
یہ نقرئی جوئے نغمگی ہے
مِندر ہے یہ زخم کی ہنسی کا
بجتے ہیں یہاں شکست کے سنکھ
تم دیکھنا اے خزاں کے جھونکو
شائد مرے عِشق کا پروہت
جَپتا ہو کہیں لہو کی مالا

O

جب گزرو گے اُس کے نقشِ پَا سے
سَجدوں کے تمہیں نشاں ملیں گے

اُن مِٹتے نقوش سے یہ کہنا
اب میری جبیں، جبیں نہیں ہے
اِک سنگِ مزار بن گئی ہے

O

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
یہ آخری اِلتجا ہے تم سے
کہنا مرے روز و شب سے جاکر
کیوں رُوٹھ گئے ہو مجھ سے آخر
دِل خوں تھا گِلہ گذار کب تھا
مَیں ایسا گُناہگار کب تھا

☆☆

شبِ رفتہ

رات نیندوں کے شبستاں میں چھناکا سا ہوا
صبح خوابِ شبِ رفتہ کا لہو لائی ہے
دھوپ کرنوں میں پروئے ہوئے شبنم کے نگیں
پرسشِ درد کو چپ چاپ چلی آئی ہے

O

آنکھ کھلتی ہے تو پلکوں پہ چتا جلتی ہے
سانس چلتی ہے کہ خونِ رگِ حسرت کا بہاؤ
اشک آنکھوں سے ٹپک جائیں تو دامن جل جائے
دِل کی دھڑکن ہے کہ صحرا میں چٹختے ہیں الاؤ

O

مَیں وہی شعلہ بہ لب زخم بہ دِل خاک بسر
راندۂ شام و سحر بخیہ گرِ چاکِ جگر
کاسۂ چشم تہی کس کو دکھاؤں جا کر
کس سے پوچھوں کہ کہاں لٹ گئے اشکوں کے گہر
خاک ہی خاک ہوں اکسیر پکار اٹھتی ہے
مَیں فغاں کرتا ہوں تاثیر پکار اٹھتی ہے

O

رُوح اک دشتِ ندیدہ ہے مگر پچھلے پہر
کہیں نزدیک سے رونے کی صدا آتی ہے

کانپ کر ڈوبتا ہے صُبح کا تارہ جس دَم
دُور سنّاٹے میں اِک چیخ لرز جاتی ہے
اِتنا محروم ہوں تدبیر کے پَر جلتے ہیں
خواب یاد آتے ہیں تعبیر کے پَر جلتے ہیں

O

مَیں کہ بھُولا نہیں وہ پیکرِ اقرار نُما
جیسے سَر تا بقدم راگنی السائی ہوئی
جُنبشِ لب ہے کہ ترشے ہوئے دِل لرزاں ہیں
رقصِ آواز کہ بہتی ہوئی چاندی کی ندی
آنکھ، جیسے کوئی جینے کی قسم دیتا ہو
گفتگو، جیسے سنوارے کوئی قِسمت میری
رُخ کہ، یُونان کے بُت گرنے عرق ٹپکا کر
اپنے شہکار کے ماتھے سے رِدا سَرکا دی

O

اب بھی احساس میں دَر آتی ہے صُبحِ شبِ دید
اب بھی شعلوں کے نگلنے کا خیال آتا ہے
تنہا تنہا نظر آتا ہوں بھری دُنیا میں
آگ سی جیسے کوئی اب بھی پلا جاتا ہے
آج وہ دَرد وہ آواز کہاں سے لاؤں
پھر سے لُٹ جانے کے انداز کہاں سے لاؤں

☆☆

خلا کی رقاصہ

عطا ہوا ہے مجھے آستانِ آدم نو
جبینِ شوق کے سجدوں کی آبرو کے لیے
لبوں کو چومتی ہے داستانِ آدمِ نو
دہانِ زخم چراتا ہوں گفتگو کے لیے
لہو نچوڑتا ہوں شعر کے سبو کے لیے
رہینِ دار ہوں، عظمت شناسِ انساں ہوں
رسن فریفتہ ہوں زینتِ گلو کے لیے
ستارہ بخت و سحر ساز و مہر ساماں ہوں
خوشا کہ طالعِ پہنائے دل پہ نازاں ہوں

O

چمن چمن ہے مرے داغ دل کا شمار
لہو کا سوز ہے زینت دہِ عذارِ گلاب
بہ طرزِ قطرۂ نیساں بہ رنگِ ابرِ بہار
دلِ صدف میں اترتا ہوں مثلِ گوہرِ ناب
میں اپنی چٹکی میں تھامے ہوئے ہوں گل کی نقاب
چھپا تو تخم کی صورت، اڑا تو خوشبو ہوں
جھکا تو شاخ کی مانند اٹھا تو مثلِ سحاب
چمن بہ سینہ رہا ہوں زِ فیضِ جذبِ دروں
ملے سحر کی غزالہ تو ایک بات کہوں

O

شفق کی سیڑھی پہ ہے تیرا خطِ پائے حِنا
اُداس اُداس ہے رُوئے نگارِ صبحِ وطن
گُھلا گُھلا سا ہے لالہ کی آنکھ کا کجرا
دُھواں دُھواں سی ہے رُخسارۂ چمن کی پھبن
غزالۂ سحری! منتظر ہیں کوہ و دَمن
سنبھال تیشہ کہ پوشیدہ ہے چٹانوں میں
ہزارہا صنمِ نو کے قلب کی دھڑکن
اِدھر بھی دیکھ کہ ہیں ہم بھی نغمہ خوانوں میں
حصارِ رنگِ بہاراں کے پاسبانوں میں

آخرِ شب

یہ ہوائیں یہ ستاروں کا سُہانا سایہ
آہ یہ خنکی یہ ٹھنڈک یہ اُداسی یہ گداز
تیرتی پھرتی ہے پچھلے کی رسیلی آواز
ڈالیاں اوس کی بُوندوں سے لدی جاتی ہیں
چاندنی کوہ کے ماتھے سے اُتر آئی ہے
یہ گھنی رات یہ مہکی ہوئی افسردہ فضا
دُور تالاب کے منظر کی سلونی رنگت
فرش پر لیٹا ہوا نیل گگن ہو جیسے
یہ شب ماہ دعاؤں میں مگن ہو جیسے

O

سُرمئی دُھند میں لپٹا ہوا بوجھل منظر
گُل زمینوں کی خموشی میں یہ سَر یہ سَرگم
یہ چٹانیں یہ تراشیدہ نگیں فطرت کے
یہ خُنک نرم ہواؤں کی چٹیلی آواز
طولِ ہجراں وہ مسیحا ہے کہ جس کے ہاتھوں
دِل کے دُکھنے کا بھی انداز بدل جاتا ہے

O

نقرئی گرد میں چُپ چاپ کھڑے ہیں اشجار
جگنو اُڑتے ہیں کہ سیلے ہوئے شعلوں کی لپک

تارے جس طرح گھنی جھاڑیوں کی گود بھریں
پھیلتی جاتی ہیں سایوں کی مقدس مہکیں
کروٹیں لیتی ہیں ہریالی کی سوندھی لپٹیں
یہ سجل رین یہ سنگیت یہ تاروں کی پھبن
کون سن پائے گا فطرت کی زبانِ معصوم
جانے کب دیدۂ انساں میں دھنک اُترے گی
ذہن کے رمنوں میں غنچوں کی مہک اُترے گی
اے مری جھومتی، اٹھلاتی زمیں کروٹ لے
دلِ ہر ذرّہ دھڑکتا ہے کہیں آہٹ لے

O

دُور ٹُوٹے ہوئے قلعہ کا پُراسرار سکوت
خامشی سر کو جھکائے ہوئے محرابوں میں
نَے، کُلاہِ سرِ شاہاں نہ شکوہِ اورنگ
نَے، گُلِ نغمہ نہ آہنگ پسِ پردۂ چنگ
گُنگ ہے خواجگیٔ رقص وطرب برسوں سے خندہ
زن ہے قمرِ آخرِ شب برسوں سے
نَے، کنیزانِ سمن فام و مسیحا نفساں
دلبراں، لالہ رُخاں، موکمراں، سروقداں
خوش دِلاں، خوش بدناں، خوش دہناں، خوش نظراں
مقتلِ عیش میں مصلوبِ ہوس ہو کے رہیں
گُم شدہ قافلہ کی آہِ جرس ہو کے رہیں

O

چیختے ملبے پہ سنّاٹے کے قدموں کے نشاں
بھیگتی راتوں میں چُپ چاپ لُہو دیتے ہیں
پاس ہی سوئے ہوئے کتبوں کے کاواک حروف
اپنے کھوئے ہوئے نقاش کو دیتے ہیں صدا
چاندنی خستہ و درماندہ کھڑی ہے خاموش

O

دامنِ کوہ میں الغوزے کا لہرا گونجا
کوئی چرواہا دُکھے دِل کو لیے جاگا ہے
کتنے پُردرد ہیں سُر، کتنی حزیں ہے یہ الاپ
جس طرح چوٹیں رگِ جاں کی چمکتی جائیں

O

چاند لچکاتا ہے، کرنوں کے چمکتے ہوئے تیر
کس سوئمبر کے رچانے کا تمنائی ہے
رسمسے جنگلوں کی نیند میں ڈوبی ہوئی لے
رگِ منظر میں فضائے دِلِ شب بولتی ہے
ادھ کھلے غنچوں میں شبنم کی تری ڈولتی ہے
یہ فضا رس بھری کلیوں کی گرہ کھولتی ہے
یہ خنک رات ستاروں کے گہر رولتی ہے
سانولی چاندنی، مدماتی چھلک پڑتی ہے
ان ہواؤں میں گلابی سی چھلک پڑتی ہے

O

ٹمٹماتی ہیں کہیں دُور چراغوں کی لَویں
رَہ گُذر نیند بھری آنکھوں سے یوُں تکتی ہے
کہ پشیماں نہ ہو مہمانِ سُبک گام کوئی
وضعِ جادہ پہ نہ آئے کہیں اِلزام کوئی

O

یہ سَرِ چَرخ دَمکتا ہوا مَہتاب نہیں
رات کا ناگ ہے کاڑھے ہوئے مقیش کا پھَن
گَت پہ سَناٹے کی بَدمَست ہوا جاتا ہے
جھوم جھوم اُٹھتی ہے لہرائی ہوئی چندر کرن
یہ اُوداہٹ یہ دُھندلکا یہ کَسک یہ مَہکار
کُندنی پنکھ سَمیٹے ہوئے تاروں کے بدن
عرش کے نیلمیں پانی میں گُھلے جاتے ہیں
اوس کھائے ہوئے رُخسارِ صبَا کی رنگت
پَو کا چھلکا ہوا شفّاف لُہو ہے کہ نہیں
مَہکا مہکا ہوا سونے کا دُھواں چھایا ہے
قسمتِ شرقِ حسیں جاگ رہی ہے شاید
میری محبُوب زمیں جاگ رہی ہے شاید

☆☆

میرا فن میری زندگی

اے مرے فن مرے مسجود و مسیحائے جواں
تیری تخئیل کے لَو دیتے نگینوں کو سلام
تیرے الفاظ کے قدموں پہ مرے خوں کے گلاب
تیرے سینے کے درخشندہ دفینوں کو سلام
نذرِ حورانِ معانی ہے مرا غازۂ دل
قصرِ تشبیہ کے شاداب مکینوں کو سلام
عکس افگن ہے یمِ فکر میں تاروں کا گلال
منزلِ کاہکشانی کے سفینوں کو سلام

O

آج اے کعبۂ فن بارگہِ فکر و نظر
لے کے ہونٹوں پر ترا نام چلا آیا ہوں
باندھ کر زخموں کا احرام چلا آیا ہوں

O

جز ترے کس سے کہوں قلب کی دھڑکن کا مزاج
کس کو معلوم مرے درد کی لذّت کیا ہے
کون سمجھے مری دریوزہ گری کی رفعت
کون جانے مرے کشکول کی قیمت کیا ہے

O

میری دیوانگیٔ دستِ جنوں دیکھ ذرا
تارِ پیراہنِ دل تجھ کو صدا دیتے ہیں
آبلہ ہائے کفِ پا سے جل اُٹھتے ہیں چراغ
دشتِ تاریک کی وُسعت کو دُعا دیتے ہیں

O

میرے لہجے کی کسک، میرے گلو کا خوُناب
یونہی جلتا رہے بن کر تری شمعِ محراب
میرے ماتھے کی کرن ضو فگنِ بام رہے
مجھ پہ وارفتگیٔ شوق کا اِلزام رہے
میرے سینے کی حرارت مری آنکھوں کا نیاز
میری باتوں کی صداقت مرے لہجے کا گداز
میرے سجدوں کی تڑپ میرے جنوں کا انداز
میرے جینے کی تمنا مرے مٹنے کا جواز
سب تری نذر ہے اے کعبۂ فن آنکھ اُٹھا
جانِ مَن آنکھ اُٹھا، جانِ زَمن آنکھ اُٹھا

O

تیرے قصرِ طرب آہنگ کو ہو اس کی خبر
کہ ہر اک خشت میں پنہاں ہے مرا دردِ ہنر
عقدۂ خاطرِ ہر سنگ کھلا ہے مجھ پر
غُرفۂ منظرِ صد رنگ کھلا ہے مجھ پر
تیرے فیضان سے ہر ذرّہ کو دِل جانا ہے
عظمتِ آب و گِل دہر کو پہچانا ہے
عکسِ ہر منظرِ جاں تاب اُتارا مَیں نے
یوں نکھارا ترے فانوس کی دیوار کا رنگ

کتنے سیاروں کی گونجوں کا شناسائی ہوں
دیدنی ہے مری آواز کی جھنکار کا رنگ
کتنی صبحوں کی رچائی ہوئی سیّال مہک
کتنے نظاروں کی برنائیاں تیرے دم سے
نگہِ شوق کی پہنائیاں تیرے دم سے

O

جب کرن آتی ہے پابوسیٔ شبنم کے لیۓ
جگمگا اُٹھتے ہیں وجدان کی طاقوں کے دیۓ
بھری برسات کی بھرپور گھنی چھاؤں میں
دامنِ دل سے لپٹتی ہیں سنہری آنچیں
اوس پیتی ہوئی مدمست جھکاجھک بیلیں
سبز پتوں سے ٹپکتی ہوئی دھانی بوندیں
مرے سینے میں دھنک لے کے اتر جاتی ہیں
ایک عالم کی مہک لے کے اتر جاتی ہیں
جب کبھی ڈولتی پُروائی سنک جاتی ہے
نبضِ ادراک چھلکتی ہے دھڑک جاتی ہے
شاخیں جھکتی ہیں اُٹھاۓ ہوۓ پھل پھول کے ناز
یہ وہ ہنگام ہے جب قلب میں آتا ہے گداز
جب کلی کھلتی ہے، جب بندِ قبا کھلتے ہیں
گُہرِ منظرِ آئینِ نمو رلتے ہیں
جب شفق اپنے ہی دامن میں لگاۓ ہوۓ آگ
رقص کرتی ہے تو چھڑ جاتے ہیں احساس کے راگ
جب شبِ ماہ دلِ غنچہ میں در آتی ہے
برگ میں نُطق کی تاثیر نظر آتی ہے

مَیں نے مہتاب سرِ شاخ و شجر دیکھا ہے
پتّی پتّی پہ کفِ پائے قمر دیکھا ہے

O

رفعتِ فکر کی منزل پہ پہنچ کر اکثر
کِتنے نادِیدہ جہانوں کو صدا دی مَیں نے
کِتنے نوخیز عناصر کو بہ عنوانِ نمو
اپنے افکار کے دامن کی ہوا دی مَیں نے
کِتنے اذہان میں روشن کیئے فردا کے چراغ
کِن مریضانِ قدامت کو شِفا دی مَیں نے
کِتنی ماؤں کے کلیجوں کو عطا کی شبنم
کِتنی بہنوں کی جبینوں کو رِدا دی مَیں نے
توڑ کر جبر کے سُورج کو زفیضِ تنویر
دلِ ہر ذرّہ کی تقدیر جگادی مَیں نے
مجھ سے دیکھی نہ گئی سادگئ دستِ وطن
شجر و شاخِ رگِ جاں کی، حِنادی میں نے
جب بھی کھلیان کے سونے کی عماری دیکھی
آدمِ نو کی صلابت کی دُعا دی میں نے
جب کہیں دیکھا کسی بانکے سپاہی کا غُرور
دِل تو کیا رُوح کی پیشانی جھکادی میں نے
ورطۂ بحر میں تھے حلقۂ صد کامِ نہنگ
سب کو قدرِ گہرِ ناب سکھا دی میں نے

O

کتنے منظر مری نظروں میں کُھلے جاتے ہیں
نوکِ میزانِ بصیرت پہ تُلے جاتے ہیں

کتنے معصوم ہمکتے ہوئے بچوں کی ہنسی
لبِ افکار پہ چٹکاتی ہے جوہی کی کلی
کتنے تُرکانِ سَمن فام کا دیکھا ہے سُبھاؤ
جگمگاتے ہوئے کنگن کا کلائی میں گُھماؤ
پردۂ فن کے لیئے رنگ چرُائے کیا کیا
بہ ایں پندارِ نظر ناز اُٹھائے کیا کیا

O

کتنی کٹیاؤں کے سہمے ہوئے بے نور چراغ
ہوگئے ہیں مرے افکار کی منزل کا سُراغ
کتنے سوئے ہوئے چولھوں کا پریشاں بھوبھل
چشمِ بینائے تخیل کا ہے کورا کاجل
کتنے ہونٹوں پہ دعاؤں کی کسک دیکھی ہے
کتنے جلتے ہوئے زخموں کی تپک دیکھی ہے
کتنی آنکھوں میں تھکی ہاری چمک دیکھی ہے
کتنے ہاتھوں میں گدائی کی جھجک دیکھی ہے
تیرے عرفان سے وہ دیدۂ بینا پایا
دولتِ زیست مِلی غم کا قرینا پایا
ورنہ سوزِ دلِ بیتاب کہاں سے مِلتا
شیشۂ زیست کو خوناب کہاں سے مِلتا

O

آزرِ لوح و قلم نے ترا ہر پیکرِ نقش
اتنی محنت سے تراشا ہے کہ جی جانتا ہے
ہر بُنِ مُو کو زباں دی مگر اس ارماں نے
اس قدر خون رُلایا ہے کہ جی جانتا ہے

اپنا سرمایۂ جاں تجھ پہ بصد حُسنِ خُلوص
بے دریغ اِتنا لُٹایا ہے کہ جی جانتا ہے
اپنا ہی چاکِ جگر اپنے ہی زخموں کا حساب
یوں نگاہوں سے چُھپایا ہے کہ جی جانتا ہے
گردشِ شام و سحر نے بہ لبِ خندہ طراز
حال اِس طرز سے پُوچھا ہے کہ جی جانتا ہے

O

اے مرے فن مرے مسجُود و مسیحائے جواں
تیرے پیراہنِ خُوناب فشاں کی خاطر
جُستجوئے نگہِ دیدہ وراں کی خاطر
تحفۂ درد لیئے بابِ وطن تک پہنچا
مَیں غزالاں کے لیئے شہرِ خُتن تک پہنچا
تج دیئے دیدہ و دِل سوزِ گلو نذر کیا
اپنی آواز کے کاسہ میں لہُو نذر کیا
خوں سے گُل رنگ تھا ہرتارِ گریبانِ حیات
دیکھ کر محفلِ صاحب نظراں جھوم اُٹھی
میری شام و سحرِ درد کی پہنائی پر
کتنے ہونٹوں پہ حدیثِ دگراں جھوم اُٹھی
اس تفکّر پہ کہ ہر سنگ ہے مسجُودِ خیال
نخوتِ دیدۂ آشفتہ سراں جھوم اُٹھی
رکھ دیا یوں دلِ ہر ذرّۂ گیتی کا حساب
وسعتِ دید پہ چشمِ نگراں جھوم اُٹھی
میرے آئینۂ نغمات کی گل کاری پر
نازشِ کارگہِ شیشہ گراں جھوم اُٹھی

پھر بھی لبِ تشنہ کو صہبا نہ ملی خُم نہ مِلا
داد و تحسین تو مِلی، دانۂ گندم نہ مِلا
سَر برہنہ کو کوئی سایۂ ایواں نہ مِلا
آبلہ پا کو کہیں فرشِ گلستاں نہ مِلا
میرے نغمات مرے شعر پہ بَن آئی ہے
دَر بہ دَر کُوچہ بہ کُوچہ مِری رُسوائی ہے
مہرِ درسینہ کو کشکول بکف ہونا تھا
دُرِ خوش آب کو محجُوب خَزف ہونا تھا

O

اے مِرے فن مِرے مسجُود و مَسیحائے جواں
لے کے ہونٹوں پہ ترا نام چلا آیا ہوں
باندھ کر زخموں کا احرام چلا آیا ہوں

O

آزمائش کی گھڑی دیکھ قریب آئی ہے
میں کہ عیسیٰ ہوں مقدر میں صَلیب آئی ہے
تیرا پَرتو مِری ہستی کا نگہدار رہے
دِل و جاں کو ہوسِ لذّتِ آزار رہے
اِس شبِ تیرہ کو اب صُبح کا تارا دیدے
پوَ کو آواز دے جینے کا سہارا دیدے

☆☆

ایک صُبح

سَنکیں ہوائیں مدھ بھری
اوشا کے گھنگرُو بج اُٹھے
کھنکی شفق کی طشتری
لہرا گجر کا جھوم کر
شبنم کے دِل میں گھُل گیا
دَوڑیں صَبَا کی ہرنیاں
نافہ گلوں کا کھُل گیا
چھلکی ہوئی چاندی کی ضَو
پھولوں کے ایوانوں میں ہے
پھوٹی ہوئی پَو کا لہُو
سبزے کی شِریانوں میں ہے

O

کلیوں کے سِیپ آسُودہ ہیں
سینے کے حُجروں میں لیے
خوابِ شگفتن کے گُہر
یہ صُبحِ تازہ یہ سَماں
یادِ فسردہ تو نہیں
یہ بادلوں کی سِلوٹیں
رَختِ دریدہ تو نہیں

O

بِیتی ہوئی گھڑیاں مجھے
چُپ چاپ تک کر رہ گئیں

شب تاب بزمِ دَرد کی
شمعیں بھڑک کر رَہ گئیں
بُوندیں لہُو کی قلب سے
سَن سَن ٹپک کر رَہ گئیں

O

تیری جُدائی میں کبھی
ایسے بھی گُزرے روز و شب
چوکھٹ پہ گھر کی مُدّتوں
سُورج نے دستک بھی نہ دی
آنگن میں دُھوپ اُتری نہیں
صُبحوں نے پرسش بھی نہ کی

O

شاموں نے آنکھیں پھیرلیں
کاجل کے ڈورے کھو گئے
گیندا فلک پر چاند کا
کِھل کِھل کے مُرجھاتا رہا
میرے در و دیوار پر
غم کی نگہبانی رہی
صحرا کی ویرانی رہی

O

پچھلے نے جوڑا باندھ کر
نجمِ سحر گوندھے ہوئے
ہنگامِ رُخصت مُدّتوں
مجھ سے اجازت تک نہ لی

O

اکثر پلک پر اشکِ غم
چمکا، چمک کر بجھ گیا
تاروں نے پوُچھا تک نہیں
راتوں نے دیکھا تک نہیں

O

تیری نگاہِ مہرباں
شبنم صفت کھوئی ہوئی
آزُردہ قامت کی پھبن
اَفسُردہ ہر عضوِ بدن
رَگ رَگ خُمارآلود، یوں
نیندوں کے جھونکوں کا سَماں
منظر دَھنک کے کھیت کا
چٹخائے جیسے اُنگلیاں
پلکوں کے بھاری پَن پہ تھا
کتنی دُعاؤں کا گُماں
آنکھوں میں سُر تھے جوگ کے
لَب احمریں آتشکدے

O

دیوارِ دل سے یاد کے
سائے اُتر کر رَہ گئے
موتی تری گفتار کے
چِھن چَھن بکھر کر رَہ گئے

O

یادش بخیر، اِک وقت تھا
نم آستیں تقدیر تھی
لیکن بہ ایں رنج و الم
سوغم کی راتیں اِک طرف
اِک صبحِ نو مشعل بکف
جیسے مداوا بن گئی
میرا مسیحا بن گئی

☆☆

نغموں کی مسیحائی

سوچتا ہوں کہ بیتے ہوئے روز و شب
کیوں تھے اِک عُمر تک تشنہ کامِ طلب
زندگی اجنبی موت بھی اجنبی
مَیں نے کاٹے ہیں ایسے شب و روز بھی
مُجھ پہ پیغامِ شام و سحر بند تھے
بابِ لُطفِ مسیح و خضر بند تھے
میرے سُورج کے دامن میں کرنیں نہ تھیں
میرے مہتاب کے دِل میں آنچیں نہ تھیں
تشنگی نا اُمیدِ لبِ جام تھی
جُنبشِ ہر نفس ایک اِلزام تھی
صُبح کی کمسنی شام کی دِلبری
رفتہ رفتہ یہ دولت بھی لُٹتی گئی
مُجھ سے اشکوں کی زنجیر تک چِھن گئی
بختِ خُفتہ کی تحریر تک چِھن گئی
خواب کی دیوی قہقہ لگاتی رہی
اور تعبیر خوں میں نہاتی رہی
آندھیاں دِل کے صحرا میں اُٹھتی رہیں
دھجیاں میرے دامن کی قسمت بنیں
دِل بگولے کی صورت بھٹکتا رہا
نافۂ درد بن کر مہکتا رہا
زِیست کی ساعتیں نیشتر ہوگئیں

میری رُسوائیاں دَر بہ دَر ہوگئیں
یک بہ یک وادیٔ دِل میں آہٹ ملی
سازِ احساس کو گنگناہٹ ملی
ایک دستک کی آواز بڑھتی گئی
صورتِ شعلۂ ساز بڑھتی گئی
پردۂ ذہن پر میں نے محسوس کی
ایک چمکیلی، بہتی ہوئی راگنی
چاپ نغمات کی سَر سَراتی گئی
میری رَگ رَگ میں شمعیں جلاتی گئی
یک زبان ہو کے نغموں نے مجھ سے کہا
سُن شہیدِ سِتم ہائے صُبح و مَسا
ہم ترے چاکِ داماں کے ہیں بخیہ گر
ہم ہیں تیرے مسیحا ترے چارہ گر
تیرے فانوسِ خاطر میں شعلہ ہیں ہم
مُو بہ مُو صورتِ جوشِ صَہبا ہیں ہم
ہم فضاؤں میں پھیلے تو آتش بجاں
صورت رَعد ہیں بادلوں میں رَواں
ہم گھٹاؤں میں رَچ کر گُہر بار ہیں
فصلِ باراں میں بوندوں کی جھنکار ہیں
بَن کے للکار کوہ و کمر کاٹ دیں
تُندسیلِ رَواں کا جگر کاٹ دیں
برگِ گُل ہائے نازک کو جھنکار دیں
پتھروں کو بھی اعجازِ گفتار دیں
ہم کبھی لحنِ بادِ صَبا بن گئے

قُمریوں کی سریلی صدا بن گئے
راگ بن کر سَرِ صحنِ گُلشن مِلے
بند کلیوں کو وقتِ شگفتن مِلے
طائروں کے گُلو میں پرافشاں رہے
سینۂ ساز میں حشر ساماں رہے
آبشاروں کے لَب پر ترانہ بنے
موج در موج چنگ و چغانہ بنے
ہم چمن در چمن راز در راز ہیں
ہم کلی کے چٹکنے کی آواز ہیں
رفعتِ فکر کے آفریدہ ہیں ہم
صورتِ غنچۂ نَو دمیدہ ہیں ہم
تُو ہمیں درسِ عزمِ تگ و تاز دے
طائرِ شوق کو اِذنِ پرواز دے
تُو ہمیں اپنا سوزِ نہاں نذر کر
خُونِ احساس کا ارمغاں نذر کر
اپنی تخئیل کا پیرہن بخش دے
اپنا سرمایۂ جان و تن بخش دے
مرغزاروں کی رنگت عطا کر ہمیں
کوہساروں کی رفعت عطا کر ہمیں
اُگرئ شام کی خامشی سونپ دے
چودھویں رات کی چاندنی سونپ دے
شُوکتی ندیوں کا سَماں بخش دے
کُوکتی کوئلوں کی زبان بخش دے
شاخ کا لوچ کونپل کی دوشیزگی

پھول کی باس شبنم کی تابندگی
دے ہمارے لبوں کو مٹھاس اوس کی
نَم ہواؤں کی مہکی ہوئی تازگی
بوئے گُل کی طرح کر چمن آشنا
سُنبل و سوسن و نسترن آشنا
تُو بتا دے شفق کی مئے احمریں
کیا جبینِ قمر کا عَرق تو نہیں
ابرِ رنگیں کہیں خواب پارے نہ ہوں
جھرنے نیندوں کے سیّال دھارے نہ ہوں
بھونرا اِک پُرفشاں لیلِ نغمہ نہ ہو
جگنو آوازِ فطرت کا شعلہ نہ ہو
کِس لیۓ زخم لالے کے بھرتے نہیں
پھول مرُجھا کے فریاد کرتے نہیں
ریگ زاروں پہ پھیلی ہوئی سیپلیاں
ابرِ نیساں سے کیوں ہیں شکایت کُناں
فاش کر ہم پہ رَازِ حیات و مَمات
زَہر کیا چیز ہے، کیا ہے قند و نَبات
فرشِ مقتل سے اُٹھتا ہے شورِ جنوں
ہم سے کیا کہہ رہا ہے صَلیبوں کا خوں
ہم سے کیا کہہ رہی ہے نگارِ زمیں
ہر خمِ زُلفِ گیتی ہے عصر آفریں
چاکِ دَامن کا اِعزاز کیا چیز ہے
طوقِ آہن کا اِعزاز کیا چیز ہے
کیسے کیسے نِکھرتی ہے تابِ سُخن

تنگ ہوتے ہیں جب حلقہ ہائے رَسَن
آب و گِل میں نمُو کی حرارت ہے کیا
ذرّہ ذرّہ میں پوشیدہ دولت ہے کیا
نبضِ آہن کی دھڑکن کا کیا راز ہے
آسماں بوس خرمن کا کیا راز ہے
دشت و صحرا میں کیوں بُوئے گُلوار ہے
کیا کفِ آدمِ نو حِنا بار ہے
گت پہ صدیوں کی ہے رقصِ سیّارگاں
کون سا راگ چھیڑے گا عصرِ رواں
لمحۂ عصرِ نو کیوں قرن ساز ہے
قصرِ امروز میں کس کی آواز ہے
گردشِ خُوں رگِ سنگ میں تیز ہے
کس طرح ضربِ تیشہ صنم خیز ہے
شاعرِ خوش نوا مہر زادِ زمیں
تیرا معمورۂ فکر تنہا نہیں
کتنے نغموں کی پیغمبری ساتھ ہے
ساحری ساتھ ہے داوری ساتھ ہے
آنکھ تیری ہے رمز آشنائے دروں
تیرے ساغر میں ہے آفتابوں کا خُوں
تیرا دستِ رسا کہکشاں گیر ہے
خاک بھی تیری مُٹھی میں اکسیر ہے
تیرے دِل میں مثالِ صداقت ہیں ہم
طالعِ صبحِ نو کی بشارت ہیں ہم

☆☆

زخمی دریچے

پھر وہی نیم شبی پھر وہی آغازِ خلش
اب مگر بارِ طرب غم سے کہاں اُٹھتا ہے
طاقِ دل دیکھ پسِ گرمیٔ بزمِ خوباں
کیسے پگھلی ہوئی شمعوں سے دُھواں اُٹھتا ہے

○

کس نے دیکھا ہے مرے پچھلے پہر کا ہنگام
کون جانے مرے مہتاب پہ کیا گزری ہے
میرے تاروں پہ سرِ چرخِ الم کیا بیتی
میرے بام و در و محراب پہ کیا گزری ہے
مری ٹوٹی ہوئی نیندیں مرے بکھرے ہوئے خواب
مری راتوں کا مقدّر، مری صبحوں کا عذاب

○

رات خاموش، فلک گنگ، ستارے چپ چاپ
صحن خوابیدہ، شجر سرد، ہوائیں مبہوت
آنکھ نمناک، نظر چور، نظارے چپ چاپ
آہِ دل، اذنِ بقا مانگ رہی ہو جیسے
میری تنہائی دُعا مانگ رہی ہو جیسے

○

سرِ دیوار لچکتی ہوئی بیلیں چپ ہیں
مدّتیں بیت گئیں گل ہوئے پھولوں کے چراغ
میری راتوں کو میّسر تھے رسولوں کے چراغ

○

روز ٹُوٹے ہوئے پتّوں کی صَدا آتی ہے
روز آنگن کی زمیں جیسے دَندک جاتی ہے
ٹُوٹے پتّوں کو سرِ شاخ سَجانے کی لگن
اپنے رُوٹھے ہوئے پیڑوں کو مَنانے کی لگن
جانے کیا وَہم ہے، دے اُٹھتا ہے لَو ہر بُنِ مُو
میری گردن پہ نہ ہو برگِ چکیدہ کا لہُو

O

سخت ہے مُجھ پہ تقاضائے شب و روزِ جنوں
قرض ہے مہر کی کرنوں کا مِری صُبحوں پر
میرے دَامن پہ جھلکتا ہے شبِ ماہ کا خُوں

O

سوچتا ہوں کہ کہیں زَہر نہ دے بادۂ صُبح
ہر شب غم کی نگاہوں میں ہے اندیشۂ صُبح

O

کورے مٹّی کے پیالے کی طرح نیل گگن
رات کے چاک سے جس وقت نکل آئے گا
پارۂ برفِ طِلا فام کی مانند قمر
جب شفق رنگ جزیروں میں پگھل جائے گا
شَست باندھے ہوئے سُورج کی کِرن آئے گی
پھر سے ہوجائیں گے دروازوں کے شیشے زخمی
میرا کمرہ، مِرے کمرے کے دریچے زخمی

☆☆

سالگرہ

یہ ذوقِ سفر یہ گردِ ایّام
صحرا کا یہ خواب گوں دُھندلکا
لالہ کا چراغ تک نہیں ہے
خوابیدہ اُداس اُداس منظر
سُورج کو منا رہا ہے کب سے

O

یہ دولتِ زادِ راہ کیا ہے
دُکھتے ہوئے آبلوں کی سُرخی
بے مہر ببُول کی رفاقت
ڈستی ہوئی ریت کی خموشی

O

کس موڑ پہ ہے بہارِ زرّیں
کس راہ پہ کُنجِ نسترن ہے
کس سَمت ہے جُوئے آبِ نوشیں
کوئی تو بتا دے اب خدارا
بائیس برس گزر چکے ہیں

☆☆

دیارِ نیم شبی

دیارِ نیم شبی جلوہ گاہِ درد و نشاط
ترے سوادِ فلک تیرے ماہتاب کی خیر
تری فضا میں رچی ہے اُداسیوں کی مہک
ترے نجوم کے بیدار اِضطراب کی خیر
مِلی ہے دولتِ چشمِ پُر آب بہرِ نگاہ
دلِ نظارہ ترے دردِ بے حساب کی خیر

○

یہ خواب ساز فضا یہ دُھلا دُھلا منظر
گلاب زاروں پہ رُلتے ہیں شبنموں کے گہر
لچکتی ڈالیاں تر دامنی سے بوجھل ہیں
طراوتوں کی نقاب اَفگنی سے بوجھل ہیں

○

خمیدہ، نرم، ہری پتّیوں کے ریشوں میں
تمام پگھلی ہوئی آگ کی ہیں قندیلیں
رسیلی، مدبھری خاموشیوں کی مست الاپ
یہ راگنی یہ قمر کے سنہرے پاؤں کی چاپ
یہ دشتِ چرخ یہ بنجارے ابر پاروں کے
یہ سوتے جاگتے ارماں مدھر ملاروں کے

ندائی شبِ کی نگاہوں کا یہ سُہانا پَن
یہ غنچگی یہ سجل رُوپ یہ کنوارا پَن

O

دیارِ نیم شبی جلوہ گاہِ درد و نشاط
غریب شہرِ شبِ ماہ کو سہارا دے
بھلا چکے ہیں مجھے تیرے ماہتاب و نجوم
اب اُن کو یاد نہیں دردِ خاطرِ معصوم
مَیں نغمہ ساز ہوں پہچان لے مِری آواز
وہی کسک ہے وہی ہے لٹا لٹا انداز
وہی لبوں پہ دُعاؤں کے خون کا اِلزام
پلک پلک پہ وہی تہمتِ چراغاں ہے
وہی ہے قلب پہ نشتر کے ٹُوٹنے کا گماں
نباہنے کا وہی زندگی سے پیماں ہے

O

مَیں آج ڈھونڈھ رہا ہوں خرابۂ دِل میں
حنا بدست، گُل اندام، صندلیں پیکر
لگاوٹوں میں نہاں حسرتِ شکیبائی
قبا سے لپٹی ہوئی نکہتِ شناسائی
کسی کا قُرب، فقط درد آشنائی ہے
بس اِک خلش ہے کسی کی نظر، کچھ اور نہیں
یہی کہا ہے شبِ التفات نے مجھ سے
کہ نوکِ نشترِ غم ہے سحر کچھ اور نہیں
کسی کے لُطف کے باوصف مَیں نے جانا ہے
نصیبِ عشق بجز چشمِ تر کچھ اور نہیں

O

دیارِ نیم شبی سُن یہ مژدۂ خوں رنگ
کہ اب تو یادوں کی اگلی سی شعلگی بھی نہیں
نہ رَتجگوں کا جُنوں ہے نہ آنسوؤں کا ہجوم
سَحر کے ڈوبتے تاروں سے دوستی بھی نہیں
شکستگیٔ دِل و جَاں کا رَنج کیا ہوگا
جو سَچ کہوں تو کچھ ایسی مجھے خوشی بھی نہیں

O

دیارِ نیم شبی جلوَہ گاہِ دَرد و نشاط
وہ میرے خواب وہ میری وَفائیں لوٹا دے
مجھے وہ زُود پشیماں دُعائیں لوٹا دے

☆☆

آب و گل

مُجھے یاد پڑتا ہے اِک عُمر گوری
لگاوٹ کی شبنم میں لہجہ ڈبو کر
کوئی مُجھ کو آواز دیتا تھا اکثر
بُلاوے کی مَعصومیت کے سہارے
میں آہستہ آہستہ پہنچا یہاں تک
بہ ہر سَمت اَنبوہِ آوار گاں تھا
بڑے چاؤ سے میں نے اِک اِک سے پُوچھا
"کہو کیا تُم ہی نے پُکارا تھا مُجھ کو
کہو کیا تُم ہی نے پُکارا تھا مُجھ کو"
مگر مجھ سے اَنبوہِ آوار گاں نے
ہراساں ہراساں پریشاں پریشاں
کہا صرف اِتنا "نہیں وہ نہیں ہم
ہمیں بھی بُلا کر کوئی چُھپ گیا ہے"

☆☆

عہدِ وفا

(نذرِ یارانِ علی گڑھ)

وطن کی شام غریبِ وطن پہ بھاری ہے
دیارِ شوق سے آیا ہے نکہتوں کا پیام
فضا پہ آج مسیحا نفس کا دھوکہ ہے
دُکھی ہواؤں کا انداز مَریمی ہے تمام
شجر شجر کا یہ سِنگھار یہ دِلآویزی
ہوئے ہیں سایہ فِگن مُجھ پہ شاخِ گُل کے خیال
اُبھر رہا ہے رفیقوں کا ایک اِک چہرہ
حیات جیسے گلے مِل رہی ہو نامَ بہ نام
نظر میں رنگ، مژہ پر کرن، جبیں پہ سحر
یہ کون بھیجتا ہے مجھ پہ مہروَمَہ کے سَلام
سَلام تُم پہ رفیقانِ مہر و ماہ پَناہ
مِرے اندھیرے اُجالے مہکتے جاتے ہیں
تمہارے دَم سے مِلی ہے شفق کی نامہ بَری
قدم نگارِ سحر کے بہکتے جاتے ہیں
مِری نِگاہ کے سَرشار خواب گُوں ارماں
خیالِ ہم نفساں سے چھلکتے جاتے ہیں
مِرے سَواد کے شیشے ہیں زیرِ شفقتِ سنگ
جو اِلتفاتِ گراں سے دَھڑکتے جاتے ہیں

میں کیا کہوں دَر و دیوار کی دُہائی ہے
لہُو کے قطرے جَبیں سے ٹپکتے جاتے ہیں

مِرا دیار مِری خواب گاہِ اَرماں ہے
بقدرِ شوق یہاں لُطفِ رنگ و بُو بھی نہیں
میں دِل کی آگ سے دَامن جَلا چکا کب کا
مِرے نصیب کہ کوئی شرارہ جُو بھی نہیں
کِسے سُناؤں کہ میری نوا ہے بانگِ رحیل
کہ قدر دانیٔ خُوں نابہ گُلو بھی نہیں
یہاں اُٹھائے ہیں مَیں نے عذابِ جنسِ ہُنر
وہ اشک ہوکہ گُہر پاسِ آبرُو بھی نہیں
یَہاں مِلی مجھے ناموسِ آستیں کی سزا
کہ آج دامنِ دِل لایقِ رفُو بھی نہیں
مگر سَنبھال کے رکھی ہے میں نے آبِ نِگاہ
کہ جس کی چھوٹ نظاروں کی مَانگ بھرتی ہے
دلِ گداز، بھرے بادلوں کی کیفیت
کہ جس سے شام و سَحر پر پھوار گرتی ہے
جواں ہیں وحشتیں اَرماں کے مِرگ نینوں کی
یہ ڈار آس کی وَادی میں روز اُترتی ہے
بندھے ہوئے ہیں اُمنگوں کے پاؤں میں گھُنگرُو
چھمکتی گاتی ہوئی نغمگی بکھرتی ہے
تصوّرات کی دیوی سَدا سُہاگن ہے
کہ رنگ رنگ جزیروں پاؤں دَھرتی ہے
یہ دل کہ ہے روشِ خوش خرامیٔ یاراں
زفیضِ روشنیٔ طبع لالہ کار رہے

شبِ سیاہ چراغوں کی لَو بڑھائے ہوئے
دُعا بہ لَب ہوں کہ سُورج پہ اعتبار رہے
شُعاعِ مہر سے ہوتے ہیں روز قول و قرار
کہ شبنمِ گُلِ اُمید تاب دَار رہے
صَدا دو مجھ کو تمہاری صَدائیں ہیں مہمیز
کہ پائے شوق کو منزل پہ اختیار رہے
تمہارے خُلد کی چوکھٹ پہ میرا نقشِ جبیں
جُنوں وقَار رہے دَرد آشکار رہے

پاکئ داماں کی حکایت

شاذ کیوں چُپ ہو یہ آشفتہ سَری کیسی ہے
تم تو کہتے تھے کہ بیتے ہوئے ایام کی یاد
جب بھی آئے گی بَہاروں میں چُھپی آئے گی
سات رنگوں کی عَماری میں چلی آئے گی
چاند سُورج کے کہاروں پہ سجی آئے گی
پھر یہ دُکھ کیا ہے یہ دَامن کی تری کیسی ہے
مُسکرادو کہ کریں دِید کے ہَنگام کی یاد
کم نہیں نشّہ سے کچھ دُردِ تہِ جَام کی یاد

O

یوُں نہ اندھیر کرو، یوُں نہ مِٹاؤ خود کو
بارِ تنہائی بھلا کِس نے اُٹھایا ہوگا
ایسے پاگل نہ بنو پیار کی سَوگند تمہیں
اوّلیں دَرد کے اقرار کی سَوگند تمہیں
میرے اُجڑے ہوئے سنگھار کی سَوگند تمہیں
کس نے اِس طرح محبت کو نبھایا ہوگا
دیکھو ہر موڑ پہ اب یوُں نہ لُٹاؤ خود کو
میری خاطِر سہی جینا بھی سکھاؤ خود کو

O

کچھ تو بولو مجھے سو طرح کے وَہم آتے ہیں
تم کبھی اِتنے کٹھور آج سے پہلے تو نہ تھے
تُم یہ سوچو تو سہی، کوئی غمیں اور بھی ہے

آگ دَہکی ہوئی سینے میں کہیں اور بھی ہے
اِس شوالے میں اِک آزُردہ مکیں اور بھی ہے
مُجھ سے رُوٹھے تھے مگر آپ سے روٹھے تو نہ تھے

O

کیا ہوا تم کو مرے تیر چُبھے جاتے ہیں
روز و شب دَرد کی بیداد پہ تھراتے ہیں
بور کی رُت ہے ہَری کونپلیں رَس لائی ہیں
بادَل اَن جان ہیں لائے ہیں مِلن کے سپنے
دیر سے آیا ہے موسم کا سلونا پیغام
مان لو کہتی ہوں، بَس اب نہ جپو میرا نام
مرے زَرتشت مری آگ کی پوُجا ہے حَرام
پاپ کی طرح ڈسے جاتے ہیں مَن کے سپنے
کیسی تاریکیاں احساس پہ مَنڈلائی ہیں
کِتنی راتیں مری پرُسِش کو چلی آئی ہیں

O

مُجھ میں کب تاب ہے، کِس مُنہ سے دلاسہ دُونگی
تم مجھے پا نہ سکو، میں تمہیں اَپنا نہ سکوُں
لاکھ اَرمان کے سینے سے لگائے کوئی
مانگ موتی سے بھرے کنگنا پہنائے کوئی
بے سبب رُوٹھوں تو بے بات مَنائے کوئی
کیسی یہ شمعِ تصوّر ہے کہ پگھلا نہ سکوں
سوچتی ہوں تمہیں آنسو کے سوا کیا دُوں گی
کیا میں اپنی ہی تمناؤں کو پرُسہ دُوں گی

☆☆

گہن اور دُھوپ

مجھے مرنے کا سودا بھی نہیں اے گردشِ دوراں
میں گھِر کر رہ گیا ہوں زندگی کے خارزاروں میں

O

مجھے جب بھی رُلاتی ہے مِری آشفتہ سامانی
خیال آتا ہے شاید میں ازل کے گرم ہونٹوں پر
محبت کا پیامِ حرفِ سادہ بن کے اُبھرا تھا
تمہارے واسطے بھیجا گیا تھا، میں تمہارا تھا
مگر تم سُن نہ پائے اور میں آوارہ و رُسوا
خلا کی اجنبی پہنائیوں میں پَرشکستہ ہوں
مجھے تسلیم ہے اَپنا مقدّر اپنی محرومی
اگر ہونا تھا آوازِ پریشاں میری قسمت میں
تو میں صوت جرس میں ڈوب کر منزل نشاں ہوتا
دِلوں کی ہُوک آنکھوں کی دُعا بَن کر بھٹک جاتا
غرض رُسوائیوں کو اِک جوازِ رائیگاں مِلتا

O

مِرے حصّے میں آئی باغبانی دشت و صحرا کی
مِرا خرمن ہے خار و خَس مِرا حاصل بگولے ہیں
سَرابوں کے چمکتے آئینے پھیلا دیئے کس نے
کہ جب بھی زندگانی اپنا چہرہ دیکھ لیتی ہے
تو میرے چاند سُورج مجھ پہ سو اِلزام دھرتے ہیں
مگر اب تک بَبُولوں کے تلے مجھ آبلہ پا نے
خُدا رکھے نہیں سِیکھا سَلیقہ شُکر کرنے کا

O

بگولے حادثوں کے چلچلاتی دھوپ دوراں کی
یہیں سپنوں کے ننھے ننھے بالک سر برہنہ ہیں
کہ جن کی کمسنی کو گھٹنیوں چلنا نہیں آتا
یہی سب کچھ متاعِ جان ودِل ہے جس کے صدقے میں
چٹک شعلوں کی غنچوں کی چٹک محسوس ہوتی ہے

O

مرے جی میں ہے برسوں سے لہو کا پیرہن بدلے
کہیں اب زخمِ دِل کے مندمل ہونے کا وقت آئے
مجھے بھی زندگی کو، زندگی کہنے کا ارماں ہے
مجھے بھی کوئی سن پائے کہ میں حرفِ محبت ہوں
مرے دِل کو بھی خوش آتے ہیں آب و گل کے ہنگامے
مجھے محبوب ہیں سانسوں کے میلے خاک کے پتلے
دلوں کی دھڑکنیں، ہاتھوں کی گرمی، پیار کی باتیں
ہزاروں اجنبی آنکھوں کی دِل افروز سوغاتیں
مجھے جی سے پسند آتی ہے صبح و شام کی دیوی
چرن چھونے کا ارماں آرتی بندھن کی حسرت ہے
لبھاتی ہے مجھے دہلیزِ فطرت کی جبیں سائی
اُترتی ہے گگن سے اوس جب پھولوں کے تختوں پر
مجھے اِک آنچ سی محسوس ہوتی ہے طراوت سے
نشیبوں کے چھلکتے پانیوں کے نیلے زینوں پر
مرے احساس نے دھومیں مچائیں رنگ اُچھالے ہیں
زمانہ کاش نظارے کی فرصت دے تو سمجھاؤں
سرِ صحنِ چمن بادِ صبا کی نرم آہٹ پر
قبائے گُل کا تکمہ ٹوٹتا ہے کس نزاکت سے

کبھی جی چاہتا ہے اُڑ کے پہنچوں چاند کے دَر تک
لگا کر اُس کو سینے سے کہوں "او بے وفا اب چل
بہت رُوٹھا رہا اب مَن بھی جا دل میں اندھیرا ہے"
کبھی جی چاہتا ہے، پَو پھٹے مشرق کی وادی میں
اُتر کر دُور سے سورج کو دوں آواز اور پوچھوں
"کہو تم نے مجھے جانا بھی ہے میں کون ہوں کیا ہوں!
جسے صبحِ ازل مسجودِ فطرت تم نے مانا تھا
مگر تم نے کبھی میرے دَریچوں سے نہیں جھانکا
مجھے کہنا تھا تم سے میں اُسی ٹوٹے ہوئے گھر میں
ابھی تک جی رہا ہوں اور جینے کی تمنّا ہے
سَحر آتی تو ہے گھر کی پشیمانی نہیں جاتی
بہت دن ہوگئے طاقوں کی ویرانی نہیں جاتی
تمھیں ہر روز کرنوں کا سندیسہ لے کے آنا ہے
تمھیں ہر صبح سونے کا اُجالا بن کے چھانا ہے"

O

تصوّر نے بسا رکھے ہیں دل میں سینکڑوں قریئے
نئی قلمیں لگا رکھی ہیں اُن کی سبز مٹّی میں
میں اکثر سوچتا ہوں کوئی چپکے سے اِدھر آئے
مجھے اَن جان سا پاکر، مری ویران آنکھوں پر
وہ اپنی نرم و نازک نور آسا اُنگلیاں رکھ دے۔
بصد انداز پوچھے "مجھ کو پہچانو مرے شاعر"
تو میں ہنس کر کہوں "اب تک تمہارا مُنتظر تھا میں
بَس اب آجاؤ میرے سامنے تم صبحِ فردا ہو"

☆☆

رقصِ ناتمام

خواب کا شہر جل گیا کل رات
نیند کے زخم آئے ہیں کیا کیا

آنسوؤں کی تھکی تھکی فریاد
بالشِ غمگسار کی حد تک
سِسکیوں کی تھمی تھمی سی تڑپ
کروٹوں کے حصار کی حد تک

مجرمانِ وفا سرِ مقتل
رات بھر تِلملائے ہیں کیا کیا

رنگ لائی ہے سنسناتی آگ
جل بجھی صبح، جیسے راکھ کا ڈھیر
تا بہ حدِ نگہ دُھویں کے ناگ

پاس آؤ کہاں ہو بازوئے دِل
رہگذارِ شکستِ خواب پہ ہم
خُوں میں نہلائیں رنگ و بُوئے دِل

مرنے جینے کی خود نگر قسمیں
تہِ انبارِ خاک دفن کریں
آنسوؤں کا حساب کرلیں ہم
ماتمِ بزمِ خواب کرلیں ہم
نگہِ واپسیں کا غم لے کر
باندھ لیں اپنا اپنا رختِ سفر

چُھٹ کے اِک دوسرے سے حُسن و عشق
دُور تک ڈگمگائے ہیں کیا کیا

شہرِ وفا میں

کہا تھا یہ دِل نے پسِ دردِ ہجراں
چلو چَل کے شہرِ وفا دیکھ آئیں
نہ جانے دَر و بَام کِس حال میں ہوں
فقط دُور سے دیکھ کر لوٹ جائیں
کوئی یارِ دیرینہ گر مِل بھی جائے
تو آنکھیں مِلائیں نہ آنسو بہائیں
ہوائیں قدم لیں تو انجان بَن کر
بڑی بے نیازی سے دَامن چھڑائیں
کچھ اِس طرح جائیں کہ طاقوں کی شمعیں
ہمیں دیکھ کر خود بخود جَل نہ پائیں

O

چلو اب جبیں سے لہُو تھم گیا ہے
وہاں اپنے سجدوں کا ناموس دیکھیں
اُٹھو رقصِ جام و سُبو تھم گیا ہے
پسِ بزمِ شب، رنگِ فانوس دیکھیں
نقوشِ قدم اب نہ جانے کہاں ہوں
وہ قول و قسم اب نہ جانے کہاں ہوں
وہ گفتارِ معصوم آیات کی سی
وہ لہجہ کی نرمی مُناجات کی سی

وہ راتوں کی آوارہ گردی کے چرچے
وہ صُبحوں سے آنکھیں چُرانے کے قصّے
غرض عہدِ رفتہ کے شانے ہلائیں
چلو چل کے شہرِ وَفا دیکھ آئیں

O

جُنوں آفرینی تھی شہرِ وفا میں
وہ اِک نکہتِ خُونِ تازہ ہَوا میں
نئے پائے سَرکش نئے آبلے تھے
نئے وَصل و ہجراں نئے مَرحلے تھے
سَرِ انجمن مہرباں تُم نہیں تھے
وَہاں مَیں نہیں تھا، وَہاں تُم نہیں تھے
عروسِ فضا کی تھی پوشاک دھانی
نہ تھی اپنے ماضی کی کوئی نشانی
مگر پھر بھی اِس تازہ صبح و مَسا میں
فقط ایک کہنہ روایت تھی باقی
عجب وضعداری ہے شہرِ وَفا میں
کہ آنسو بہانے کی رَسم آج بھی تھی!

☆☆

خرابہ

آہ کو پھر شب گدازی کی خلش تڑپا گئی
آج لیکن طبعِ حسرت ناشکیبا بھی نہیں
صبح تک آنکھوں کو جل بجھنے کا سودا بھی نہیں

O

چاندنی کی نیم خوابیدہ اُداسی کا فسوں
بام و در کے مضمحل شانوں پہ تھک کر سو گیا
اُڑتے اُڑتے یک بہ یک چاہت کا البیلا چکور
اندھے کہساروں کی ڈھلوانوں پہ تھک کر سو گیا
تو شگفتہ نیم رس ارماں کا پیکِ گلبدن
مدّتیں گوریں کہ ویرانوں پہ تھک کر سو گیا

O

جم گئی قصرِ طرب پرغم کی محرابوں کی گرد
زندگی کا راستہ دھندلا گئی خوابوں کی گرد
خانۂ ویراں کا لے دے کر اثاثہ ہے یہی
ایک سوتے جاگتے بُت کا سکوتِ پُرمحن
جس کے چرنوں میں نجوم و کہکشاں کی سرد راکھ
چاند چکنا چور، خوں میں تر بہ تر ہر ہر کرن
اُس کی دیوداسیوں کے پاؤں چھلنی کر گئی
فرش پر بکھرے ہوئے سورج کے ٹکڑوں کی چبھن

O

شمعدانوں کی پگھلتی موم کی بے خوابیاں
تک رہی ہیں دیر سے آپ اپنے لٹنے کا سماں

O

شہر سونا ہو گیا پچھلے کی رُت سنولا گئی
گھر کا دَروازہ کھُلا کیوں ہے کہ وعدہ بھی نہیں
میہماں کی آس کیا، رَہزن کا کھٹکا بھی نہیں!

☆☆

اجنبی

اب یہ احساس دمِ فکرِ سخن ہونے لگا
اپنی ہی نظموں کا بھولا ہوا کردار ہوں میں

O

مَیں مُسافر ہوں بیَابانِ فراموشی کا
اپنے نقشِ کفِ پا سے بھی شناسائی نہیں
تابہ پہنائے نظریت کے ٹیلوں کا سکوت
دامنِ کوہ سے لپٹی ہوئی جھیلوں کا سکوت
اپنا سَایہ بھی یہاں مونسِ تنہائی نہیں
تیر بَن کر کوئی سناٹے کے دِل میں اُترے
کِسی مایوُس پرندے کی صَدائے تنہا
زخمی آہوئے رمیدہ کی اَدائے تنہا
کاش پَل بھر کو اُتر آتا خدائے تنہا
میں کسی آزرِ گمنام کا بُت ہوں شاید
جس کی قسمت میں کوئی چشمِ تماشائی نہیں
اِذنِ فریاد نہیں، رخصتِ گویائی نہیں

O

دُور اُس پار شفق رنگ گھٹاؤں سے پرے
زیرِ محرابِ فلک، قافلۂ عمرِ رَواں
تان اُڑاتے ہوئے سَرمَست و جواں گزرا تھا
مَہ نشاں، نجم چکاں، مہرِ عناں گزرا تھا

خوں رُلاتا ہے سبک گامیٔ محملِ کا سماں
اَب بھی کوندا سا لپکتا ہے گھٹاؤں سے پرے

O

میں بھی اُس وقت سرِ راہ تھا حیراں حیراں
پا برہنہ، نظر آوارہ، تن افگار خموش
درد سے مہر بلب، صورتِ دیوار خموش
خلشِ حسرتِ جاں تھی کہ کوئی پہچانے
شمع سی دل کے نہاں خانے میں لرزاں لرزاں
مجھ پہ کیا بیت گئی، کون سنے کیا جانے
چشمِ خوں بستہ کو آسیب کا مامن سمجھا
قافلے والوں نے شاید مجھے رہزن سمجھا

☆☆

دوسری محبت

یہ اکثر تم سے مِل کر سوچتا ہوں کیا ہوا مُجھ کو
دماغِ عشق باقی ہے نہ اب ذوقِ وَفا مُجھ کو
وہی مَیں ہوُں، وہی گھر ہے، وہی سُنسان آنگن ہے
دریچوں پر وہی پھُولوں کا آسوُدہ نشیمن ہے
وہی بیلوں کی جدوَل کے تلے ٹھنڈک کی بَستی ہے
درختوں پر وہی معصوُم خاموشی برستی ہے
وہی کمرے کی دیواروں کی لَب بَستہ رفاقت ہے
کتابوں اور تصویروں کا سامانِ جراحت ہے
دَھری جاتی ہیں طاقوں پر اَبھی تک اَدھ جَلی شمعیں
گجر دَم اَب بھی سنتا ہوں پگھلتی موم کی چیخیں
ابھی پچھلے پَہر آتی ہیں آوازیں سَرابوں کی
ہتھیلی سے کوئی ملتا ہے آنکھیں میرے خوابوں کی

تُم آئے سَر بہ زانوُ ہو چلی ہے میری تنہائی
سَر آنکھوں پر تمہارا اِلتفاتِ چارہ فَرمائی

نگاہوں میں تمہاری گوکل و متھرا کی باتیں ہیں
کھُلی مہکی ہوئی زُلفوں میں بندرابَن کی راتیں ہیں
دَہکتے عارضوں پر پوَ پھٹے کا عکس لَرزاں ہے
شگرفی بازوؤں میں جیسے آتش زارِ یوُناں ہے

زِسَر تا پا نِکلتی ہیں تجلی، بانکی شُعاعیں سی
کہ جیسے ہشت پہلوُ پارۂ نیلم کی ضو تابی
ہر اِک خطِّ بدن میں بجلیاں سی ڈُوب جاتی ہیں
خمِ محرابِ لب میں پیاسی آنچیں سنسناتی ہیں
وہی لہجے کا دُکھنا جیسے خوُں تھم تھم کے رِستا ہو
وہی آنکھیں کہ جن پر التجا کا صاف دھوکہ ہو
کفِ دستِ بلوریں پر حِنا کی رنگ سامانی
جواہر کی دُکاں میں جس طرح ہیروں کی مہمانی
مبارک ہو گھنی زُلفوں کو گلبانگ اَماں ہونا
زمانے کی کڑی دھوپوں میں مثلِ سائباں ہونا
مگر میں سوچ میں گم ہوں بہ ایں الطاف برنائی
مِرے احساس پر اُودی گھٹا سی کیوں نہیں چھائی

نگاہوں کو رہا ہے مدّتوں ذوقِ چمن بینی
رچی تھی دل میں ہلکے رنگ کی کلیوں کی شیرینی
سہانی چاندنی پگڈنڈیوں پر اب بھی کِھلتی ہے
عذارِ کنجِ پر سُنبل کی لَٹ مستانہ ہلتی ہے
نہیں ہوتا مگر اب آگ پینے کا گُماں خود پر
وہ عالم ہے کہ ڈرتا ہوں نہ ہوجائے عیاں خود پر
کہاں وہ دِن مزاجِ غم کو زہر دَرد راس آئے
سرِ دامن لرز کر آنسوؤں کی التماس آئے
وہ بیگانہ دشی وہ بے نیازی بزمِ دُنیا سے
کہ جیسے تھی مجھے اِک نسبتِ دیرینہ صحرا سے

سحر کے ساتھ اب دِل میں کھٹک سی کیوں نہیں ہوتی
سرِ بالش نہ تر ہوتا مگر نم آستیں ہوتی
نہیں پہلی کرن کی سینۂ پُرخوں پہ وہ چُھوئیں
کہ جیسے نوکِ سوزن ٹُوٹ کر رَہ جائے ناخن میں
غضب ہے خاکِ در پر گر نہ ہو اکسیر کا دھوکہ
پسِ عجزِ دُعا تم پر نہیں تاثیر کا دھوکہ
زمانہ ہوگیا ہے خال و خط کو اپنی یاد آئے
نہیں ممکن کہ اَب آئینہ میرا عکس لوٹائے
سراپا جُرم ہوں آسودۂ لُطف و کرم ہوکر
میں شاید رَہ گیا پہلی محبت کی قسم ہوکر

مریمِ نغمہ

شکریں شب یہ گُل و رنگ یہ میٹھا گُہرا
چاند کے سینے میں لَو دیتا ہے سَنگیت کنول
رَس میں ڈُوبا ہوا، سُر تال سے بوجھل بوجھل

○

منظرِ خواب فضا ہے گرہِ ساز کُھلے
پھر سَرِ بزم مِرا بھید مِرا راز کُھلے
مریَم نغمہ ترِی لَے میں ہے تنویرِ شفا
ساز کے سینۂ پُرخُوں میں دَبی ہیں چوٹیں
سُر کے زخموں پہ کوئی نُور کا پھاہا رکھ دے
باندھ ہر تار کے اطراف اُجالے کا حصار
مُرکی مُرکی کے چَرن چھو کے کلیجہ رکھ دے
آنکھ کو حسرتِ خُوں تابہ فشانی نہ رہے
ضبطِ فریاد کی جی کھول کے رُسوائی کر
ساز یوُں چھیڑ کہ اشکوں کو بہانہ مِل جائے
یوُں دُکھا دِل کہ تسلّی کا گُماں ہو جس پر
تیری آواز ہے دیپک تری سانسیں ہیں ملہار
نغمگی گُھل سی گئی ہے تِری شریانوں میں
جیسے گُلبن میں ہو ساوَن کی جھڑی میں جگنو

نرت اس طرح چمکتی ہے مدھر تانوں میں
رُخ کہ گلبانگِ سکوں، جلوہ دہِ دردِ نشاط
لب ساکت پہ بھی اَستھائی کے چھڑنے کا گُماں
دیکھ کر آنکھوں کا یہ جاگتا سوتا سنسار
آکے رَس بَس گئیں بدمَست سجل راگنیاں
تُجھ کو سنگیت کی دیوی نے دُعائیں دے کر
مُسکراتے ہوئے رنگوں کی فراوانی میں
نُور کے رَمنوں سے بھیجا ہے کرن کے مانند
راگ کے سائے میں سرگم کی نگہبانی میں

O

بارہا خواب کے ہنگام یہ محسوس ہوا
میرے انفاس میں پڑتے ہیں اُجالے کے بھنور
راگنی پیار سے تکتی ہے سرہانے آکر

O

جب بھی بہکے ہوئے سرشار دِوانے بادل
پیار سے ٹُوٹ کے بدمَست چلے آتے ہیں
پَل میں ہو جاتی ہیں شرمیلی ہوائیں پاگل
لبِ احساس پہ جم جاتی ہے کُہرے کی مٹھاس
نیند بَن جاتا ہے آنکھوں میں دُھندلکے کا غُبار
برگ سے اُٹھتی ہے جب بُوند کی پہلی جھنکار
پُوچھتا ہے کوئی چپکے سے مسیحا بن کر
تُو کسی ساز کا بچھڑا ہوا نغمہ تو نہیں
کسی مِضراب کے سینے کا شرارہ تو نہیں

O

اَن سُنی راگنی پچھلے کو سُناتا ہے یہ کون
جب فضاؤں سے بَرس پڑتے ہیں گُلہائے طرب
ڈُوبتا ہے سَرِ دَریا قمرِ آخرِ شب
موجیں مقیش کے تاروں میں بَدل جاتی ہیں
چَرخ پہ لگتا ہے جب اشرفیوں کا اَنبار
چوٹیاں کوہ کی سونے سے پگھل جاتی ہیں
کِھلنے لگتے ہیں سَرِ آبِ رَواں نیل کنول
صَف بہ صَف بھونرے چلے آتے ہیں بےکل بےکل
خود بخُود جیسے کہیں بھیروِیں چھڑ جاتی ہے
چاند کی آخری کِرنوں کی صَدا آتی ہے

O

کُنجِ سَر سبز میں آئینِ خزاں کے ہاتھوں
مُنہ چھپائے ہوئے دَامانِ مَزارِ گُل میں
سِسکیاں بھرتی ہے جس وَقت پپیہے کی پُکار
کیسے تھم تھم کے سَنکتی ہے ہوائے گُلوار
پیکرِ شاخ سے جب زیورِ گُل اُترا ہے
شیونِ برگِ چکیدہ سے چمن گونجا ہے
بُو پھٹے موجِ نسیمِ سَحری کے ہمراہ
تِتلیاں سَت رنگی سَوغات لِیئے آتی ہیں
دیکھ کر خیمۂ نسرِین و سَمن کا انجام
خس و خاشاک سے گھبرا کے پلٹ جاتی ہیں
ایسے ہنگام کہیں باغ کی دیوار کے پاس
زرد سی راگنی آ کے کھڑی رہتی ہے
ایک اِک پھول کے لُٹنے کی کَتھا کہتی ہے

O

میں نے ہر رنگ میں سنگیت، کی پُوجا کی ہے
آسرا کِس کا تھا نغمات کے دَامن کے سِوا
سوچتا ہوں کہ اگر سُر نہ سَہارا دیتا
دوش پر وہ غمِ دُنیا کی گرانباری تھی
سَانس اُکھڑ جاتی مِری، تھک کے کہیں سو جاتا
ریزۂ آبیۂ شام و سحر ہو جاتا

O

نسبتِ دَرد ہے کچھ جُنبشِ مِضراب کے ساتھ
کوئی چھپ چھپ کے بُلاتا ہے پسِ پَردۂ سَاز
مُجھ سے یہ کس نے کیا سَات سُروں کا پَردہ
میرے دُکھ دَرد کا یہ کون شناسائی ہے
کون غم خوار ہے یہ کس کی مسیحَائی ہے

O

سَاز پر اُنگلیاں جس وقت رَواں ہوتی ہیں
دِل کی دیوار سے سَر پھوڑتا پھِرتا ہے کوئی
ایسا لگتا ہے بَدلنے کو ہیں میرے دِن رات
جیسے مٹّی مِری اکسیر میں ڈھل جائے گی
قند ہے جیسے مِرے حَق میں مِرا زہرِ حیات
زندگی گردشِ دَوراں سے نِکل جائے گی

O

اُف یہ مرمر کے جیئے جانے کی بے سُود لگن
محبسِ دَہر میں کیا قہر ہے سَانسوں کا جَتن
بے سَبب دِل کو گُماں ہوتا ہے جیسے تُو نے
میرے اشکوں بِھری آہوں کا سَماں دیکھا ہے

تُو نے دیکھی ہے مری رات کی گُم گشتہ سَحَر
میری بجھتی ہوئی شمعوں کا دُھواں دیکھا ہے
تُجھ پر آئینہ ہے جیسے مرا مجرُوح شباب
تُجھ سے پوشیدہ نہیں ہے مرے زخموں کا حساب

O

مَریم نغمہ تری لَے میں ہے تنویرِ شفا
تُو مری خاک کو سودائے پَرافشانی دے
رختِ ہستی کو تمنائے گریبانی دے
غم سے بھٹکا ہوں کہاں جاؤں بتا دے مُجھ کو
سینۂ ساز میں چُپ چاپ سُلا دے مُجھ کو
اپنی آواز کے شعلوں میں جَلا دے مُجھ کو
جی میں ہے کھوئے ہوئے خوابوں کی تعبیر ملے
راگ کی آگ میں جَل بُجھنے کی تقدیر ملے

☆☆

پُلِ صراط

دروازۂ دِل ہے سرد و بستہ
زنجیر صلیب بن گئی ہے

ڈھلتی ہے شبِ سکوت ساماں
مہتاب کی راکھ اُڑ رہی ہے
تاروں کے بدن کا زرد سیماب
قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے

آواز دے اے مکینِ انفاس
اے ملکۂ قافِ دردِ رفتہ
تو دیر سے چُپ ہے کیا ستم ہے
اب کھول دے در کہ وقت کم ہے
میں بھاگ کے دست بردِ غم سے
آیا ہوں پئے پناہِ شیریں
اے دیر شناسا، مان بھی جا
اِک جنسِ وفا سے لاگ کیسی!

کیا جانیے رنگِ صُبح کیا ہو
گنجینۂ بے بہائے ماضی
اِک شب کو چُرا لیا ہے مَیں نے
یہ دِید کی حسرتِ پشیماں
یہ چند رُکے رُکے سے آنسو

یہ قول و قسم، یہ عہد و پیماں
یہ درد یہ بے قرار پہلو

یہ ذوقِ دعا یہ رنجِ تاثیر
یہ کشتِ وفا یہ فصلِ تعبیر
یہ لعل و زرِ حیاتِ رفتہ
کس طرح چھپاؤں تو بتا دے
ڈرتا ہوں کہ رات کٹ نہ جائے
رہزن ہوں کوئی نہ دیکھ پائے

☆☆

بے ننگ و نام

رات ڈھلتے ہی اِک آواز چلی آتی ہے
''بھول بھی جاؤ کہ میں نے تمھیں چاہا کب تھا
کِس صنوبر کے تلے میں نے قسم کھائی تھی
کوئی طوفاں کسی پونم میں اُٹھایا کب تھا
میری راتوں کو کسی درد سے نسبت کیا تھی
میری صُبحوں کو دُعاؤں سے علاقہ کب تھا
ایک مَحمل کے سرہانے کوئی رویا تھا ضرور
پسِ محفل کسی لیلیٰ نے پُکارا کب تھا
تُم یونہی ضد میں ہوئے خاکِ درِ میخانہ
مُجھ کو یہ زعم کہ میں نے تمھیں ٹوکا کب تھا
تُم نے کیوں ''پاکئ داماں کی حکایت'' لِکھی
میرے سَر کو کسی دیوار کا سودا کب تھا
یاد کم کم ہے نہ چھیڑو مِرے مکتوب کی بات
وہ مرُوّت تھی فقط، حرفِ تمنّا کب تھا''

O

دل نہ اِس طرح دُکھا صاف مُکرنے والے
مجھ کو تسلیم کہ تیری کوئی تقصیر نہ تھی
یہ بجا ہے کہ تُجھے ذوقِ نشیمن نہ ملا
یہ غلط ہے کہ مجھے حسرتِ تعمیر نہ تھی

O

سنگ باری میں یہ شیشے کا مکاں کس کا ہے
اِس دَر و بام میں خوشبوئے وَفا کیسی ہے
کس کی آواز سے دیواروں کے سینے ہیں فگار
میرے معبود مِرے گھر کی فضا کیسی ہے
چھاؤں دیتے نہیں آنگن کے گھنیرے اشجار
غم کی چھائی ہوئی گھنگھور گھٹا کیسی ہے
ایک کونپل پہ تھا انگشت حِنائی کا نشاں
یہ لہو روتی ہوئی شاخِ حِنا کیسی ہے
کس کی تصویر ہے یہ جس پہ گماں ہوتا ہے
جانے کب بول اُٹھے، اُف یہ اَدا کیسی ہے
کس کی تحریر ہے یہ جس کے ہیں القاب عجیب
لفظ و معنٰی کے تصادم کی صَدا کیسی ہے
کس نے تکیہ پہ یہ کاڑھا ہے گِرے کا مصرع
ہائے ٹوٹی ہوئی نیندوں کی سَزا کیسی ہے

O

سوچ میں گُم ہوں کہ کِس کِس کی زباں بند کروں
آج شاید در و دیوار کو ڈھانا ہوگا
جس میں تُو ہے ترے وعدے ہیں تری قسمیں ہیں
کیا سِتم ہے کہ اُسی گھر کو جَلانا ہوگا

☆☆

رَتجگا

اندھری رات، ہوا تیز، برشگال کا شور
کروں تو کیسے کروں شمع کی نگہبَانی
اِن آندھیوں میں کفِ دست کا سَہارا کیا

کہاں چلے گئے تم سونپ کر یہ دولتِ نُور
مری حیات تو جگنو کی روشنی میں کٹی
نہ آفتاب سے نسبت نہ ماہتاب رفیق

جنم جنم کی سیاہی، بَرَس بَرَس کی یہ رات
قدم قدم کا اندھیرا، نفس نفس کی یہ رات
تمہاری نکہتِ برباد کو ترستی ہے

اب آؤ آ کے اَمانت سَنبھال لو اپنی
تمام عُمر کا یہ رَتجگا تمام ہوا
میں تھک گیا ہوں مجھے نیند آئی جاتی ہے

☆☆

اَہرمَن

مُجھے ربِّ موجود کی ذات کا
علم و عرفاں ہے، جس نے
بہ شانِ تجمّل کہا
کُن، زمیں، آسماں، چاند، سورج
ستارے، سمندر، بیاباں، شجر
کوہ، گویا ہر اِک شئے
کفِ غیب سے جاگ اُٹھی
بَشر، آب و آتش
گِل و خاک کی ایک ترکیب
قُدرت کے ہاتھوں نے تکمیل کی
شانِ یزداں نے پھر اپنی تخلیق کو
جیسے مسجُودِ ہر این و آں کہہ دیا
مَرحَبا مرحَبا کی صدائیں اُٹھیں
اور ساری فضا سَر بہ سَجدہ ہوئی
صرف ایک ہی ایسا گُستاخ تھا
جس نے چنگھاڑ کر، قہقہے مار کر
عرش و کرسی کی توہین کی

O

میں کل وقت کے گہرے ساگر پہ
لمحوں کی موجوں کے سر پٹخنے کا سماں
تک رہا تھا، معاً اک دھما کہ ہوا
طنز کے قہقہے کی بھیانک صدا نے
مخاطب کیا "سچ بتا کون قایم رہا
قول سے فعل تک، کس کے
باطن نے ظاہر کو جھٹلا دیا"

☆☆

گریزپا

راکھ کے ڈھیر میں باقی نہیں چنگاری بھی
اُس سے کہہ دو کہ محبت کا تقاضا نہ کرے
میں کہاں اور کہاں رسمِ جنونِ تازہ
اَب نہ چاہوں گا کہ کوئی مجھے دِیوانہ کرے
دلِ مرحوم کے جاگ اُٹھنے کا اِمکاں نہ رہا
وہ کسی نیند کے ماتے کو جگایا نہ کرے
آنکھ کے نوُر میں شامِل نہ کرے سرخیٔ خوُں
دِل کو دِل رہنے دے ہم رُتبۂ صحرا نہ کرے
یوُں مِلے، جیسے کوئی راہ میں مِل جاتا ہے
کوئی پیماں بھی نہ باندھے کوئی وعدہ نہ کرے
بے دلی بھی مری منظور، خموشی بھی روا
اُس کو گر پاس ہو میرا تو وہ ایسا نہ کرے
میں بہت خوش ہوں کہ جی لگ گیا پھر دُنیا میں
خوف آتا ہے کہ وہ پھر مجھے تنہا نہ کرے

○

رَت جگے ہوں گے نہ آہوں کا دُھواں اُٹھے گا
اب تو وہ رسم گئی، ریت گئی، بات گئی

گریۂ نیم شبی ہے نہ گدازِ سحری
کیا کہوں کیسے وہ پابندیٔ اوقات گئی

O

سفرِ عمرِ رواں سہل بھی دُشوار بھی ہے
مرغزار آئیں گے راہوں میں بیاباں ہوں گے
ہنس کے سہہ لو تو بہت خوب ہے افتادِ حیات
غور سے دیکھو بہاروں کے بھی ساماں ہوں گے
اُس سے کہہ دو کہ غنیمت ہے بہت ہم سفری
راہ طے ہوگی کڑے کوس بھی آساں ہوں گے
کیا خبر کون سی منزل پہ بچھڑ جانا ہے
ہم یقیں ہے کہ کسی خواب کے عنواں ہوں گے

O

اُس سے کہہ دو کہ میسّر ہے کہاں جنسِ نشاط
لمحۂ نقد سے دامان رفاقت بھر دے
میں بھی اُس زُلف میں گوندھوں کوئی مہتاب سا پھول
وہ بھی ہنس ہنس کے مجھے پیار سے رخصت کر دے

☆☆

تاریک چراغاں

تمہارے بعد تم سے چھوٹ کر کیا سخت عالم تھا
مجھے شاید شکستِ رشتۂ دِل کا بہت غم تھا
خدا جانے وہ کیا دِن تھے وہ بے بال و پری کیا تھی
اَمانت سی کوئی شئے میرے سینے میں دَھری کیا تھی
نہیں معلوم دِل میں کیا سمائی تھی تمہیں کھو کر
بھٹکتا پھر رہا تھا آپ اپنے سے جُدا ہو کر
محبت بے نیازِ رسمِ دُنیا ہوتی جاتی تھی
وفا منزل بہ منزل اور تنہا ہوتی جاتی تھی
خدا رکھے عجب اُفتاد ہے ہجرِ مسلسل بھی
گرہ میں یاد کی باقی نہیں ماضی کا اِک پَل بھی
خَلشِ سی دامنِ جاں سے لپٹ کرہوگئی رخصت
تمہارے سَنگِ دَر سے نسبتِ سَر ہوگئی رخصت
سکونِ یاس و دَورِ خود فراموشی کے دِن آئے
مبارک اے چراغِ دِل سیہ پوشی کے دن آئے
قیامت ہے کہ عہدِ سرخوشی کو خواب ہونا تھا
تمہارے رُخ کو بھی تصویرِ سطحِ آب ہونا تھا

○

پسِ مدّت بہ ایں ترکِ وَفا کیوں دِل دھڑکتا ہے
بیابانوں میں ذوقِ آبلہ پائی بھٹکتا ہے

مجھے یہ وہم زخمِ آرزو بھرنے نہیں پایا
گماں ہونے لگا ہے دل اَبھی مرَنے نہیں پایا
ہری کونپل کو جب فِطرت مئے شبنم چواتی ہے
مجھے اپنی نِگاہوں سے سُنہری آنچ۔ آتی ہے
ندا سی شام جب چھائے دُھواں اُودی گھٹاؤں کا
گماں گزُرا ہے اکثر اپنی سانسوں پر دُعاؤں کا
شبِ مَہ جب بھی اُتری کاسنی زِینوں سے تھم تھم کر
بکھر کر رَہ گئیں چنگاریاں سی دامنِ دِل پر
وہی دَریائے رنگ و بُو وہی دِل کا سَفینہ ہے
کہ جیسے مستقِل سینے میں ساوَن کا مہینہ ہے
وہی چھل بَل وہی اٹھکھیلیاں وحشی غزالوں کی
کُلاہِ کج سے ہے صاحب سَلامت ناز وَالوں کی
حسینانِ دکن کی انجمن سے رَبط باقی ہے
لبِ لعلین و خوشبوئے دہن سے ربط باقی ہے
سمن رویانِ مصرِ دل سے کنعانی کا دعویٰ ہے
اَبھی تک مجھ کو آنکھوں کی زباں دانی کا دعویٰ ہے
سَبھاؤ جانے پہچانے سے پلکوں کے جھپکنے میں
وہ ساری رکھ رکھاؤ کی سی کیفیت جھجکنے میں
خرامِ ناز سے کیا عالم پُر فن نِکلتا ہے
سخن میں سو جگہ پہلوئے حسنِ ظن نِکلتا ہے
مجھے معلوم ہے کیا سحر ہے کنگن کے بَالے میں
بھٹک جاتا ہوں رستہ اب بھی مکھڑوں کے اُجالے میں

○

سرِ سودا زدہ قایم سَلامت بزم آرائی
بڑی مشکل سے سُنتے ہیں طبیعت راہ پر آئی
دُعاؤں کا تکلف ہے نہ اشکوں کی مداراتیں
کھڑی ہیں صَف بہ صَف دیوارِ دل پر چاندنی راتیں
مگر وہ سادگی وہ دَرد کی معصومیت گُم ہے
مِری سانسوں سے وہ قول وقسم کی کیفیت گُم ہے
شکستِ وَعدہ بھی وجہِ شکستِ دل نہیں ہوتی
مجھے اب کوئی منزل آخری منزل نہیں ہوتی
کوئی منظر سہی جی کو بہر صورت بہلنا ہے
میں ہوں وہ شمع جس کو صُبح ہونے پر بھی جلنا ہے
دلِ برباد کے ذوقِ تن آسانی سے ڈرتا ہوں
میں اپنی اور آئینہ کی حیرانی سے ڈرتا ہوں
نہ کھو دے خود فریبی روز و شب کا سلسلہ بن کر
محبت رَہ نہ جائے میرے حق میں مشغلہ بن کر

☆☆

آخری تمنّا

کرم آزردہ رہوں رنجشِ بے جا نہ ملے
کیا تمنا ہے کہ اب تُو مجھے تنہا نہ ملے

شب کو تاریک بنا دے مری مہتاب نہاد
تیری انگڑائی کا چڑھتا ہوا دریا نہ ملے

صُبح سُورج کے مجیرے میں کرن کے گھنگھرو
بج اُٹھیں پر تری پازیب کا لہرا نہ ملے

خطّۂ نجدِ دِگر ہُو کا سماں ہے تو سہی
کوئی ناقہ نہ ملے، کوئی بگولا نہ ملے

اب وطن میں بھی غمِ بے وطنی ہے کہ نہیں
راستہ میں کوئی ہمدرد، شناسا نہ ملے

ہونٹ جل جائیں اگر جرأتِ فریاد کروں
گر دُعا مانگوں تو لفظوں کا سہارا نہ ملے

شہپرِ طائرِ آوارہ کا سایہ ہوا حرام
گھر سے چھوٹوں تو مجھے گوشۂ صحرا نہ ملے

زندگی مُہر بہ لب ہو تہِ بیدادِ صلیب
کوئی مریم نہ پکارے کوئی عیسیٰ نہ ملے

اشک آنکھوں میں اُمڈ آئیں تو کنکر بن جائیں
ڈوبنے جاؤں تو تنکے کا سہارا نہ ملے

سامنا ہو بھی تو کترا کے نکل جائیں گے
صرف پرچھائیاں مِل جائیں سراپا نہ ملے

اب مری نظم پہ تجھ کو نہ گماں ہو اپنا
تجھ سے اب داد بہ اندازِ تمنا نہ ملے

☆☆

خَلوَت

وَا کرو کاسنی گُل پوش دریچے جاناں
چاپ، کرنوں کی چلی آتی ہے دِھیرے دھیرے
تُم بھی پردہ نہ کرو، میں بھی تکلّف نہ کروں
چاند چُپ چاپ چلا آئے گا آجانے دو
جانے کیا کہتا ہے دیکھیں تو سَفیرِ شب تاب
کیسے کِھل اُٹھتے ہیں اس کے لب و عارض کے گلاب
کیا دُعا دیتا ہے اِس دولتِ یکجائی پر

نوشینہ سازم

شام سنولا گئی، گہرا ہوا صحرا کا سکوت
وادیاں ڈوب گئیں، کھو گئے ٹیلے میداں
تم نے جس موڑ پہ تھاما ہے مرا دستِ جنوں
دیدنی تھا وہیں سائے کی جدائی کا سماں

O

آج تک خون کی گردش میں رواں ہے کوئی
رگِ احساس میں ٹوٹے ہوئے نشتر کی طرح
کسی آہو کی فراموش صفت آنکھوں میں
میں رہا بھی تو سرائے کے مسافر کی طرح
کسی اُجڑے ہوئے مندر کا پروہت بن کر
کسی کعبہ سے نکالے ہوئے پتھر کی طرح
اپنے ہاتھوں سے مٹا دو کسی بے مہر کا نام
ثبت ہے میری جبیں پر جو مقدر کی طرح

☆☆

نہ شبم نہ شب پرستم

صبح کی آس یہی شب کی تمنّا ہے یہی
تم جو اس شہر سے گزرو تو تقاضا ہے یہی
ایک لمحے کو ٹھہر جاؤ مرے دِل کے قریب
نہ کوئی شکوۂ غم نے گِلۂ رنج و محن
اب نہیں زیبِ گلو وعدہ و پیماں کی رَسن
سَرنگوں ہوگئی الطاف و عنایت کی صلیب

○

گُل زمیں شعلۂ گُل سے ہے بھبھوکا دیکھو
جھوم کر آئی ہے متوالی گھٹا اب کے برس
صاف سبزے کی رگوں میں ہے لہُو کی چہکار
نشہ و رنگ کی ہے آب و ہوا اب کے برس
ناخنِ شوق سے مانگے ہے عجب دادِ خموش
چُست پیراہنی و بندِ قبا اب کے برس
میرے آنگن میں اُتر آئی ہے نکہت کی برات
تھال کستور کے اُبٹن کے کٹورے مہکے
کِن خیابانوں سے بورائی پوَن آئی ہے
رَس میں ڈُوبے ہوئے مدماتے جھکورے مہکے
کِس کی سکھیاں ہیں ہنسی چھوٹ رہی ہے جن کی
کون گھونگھٹ میں ہے یہ، شاخِ ثمربار کی طرح

بَر میں فردوسِ وَفا آنکھ میں واماندہ حیَا
جیسے تصویرِ مسیحا کسی بیمار کی طرح
کن جِنا ساختہ قدموں سے یہ فتنے جاگے
چونک اُٹھے میرے دَر و بام دَریچے جاگے

O

تم کو شکوہ ہے بہ ایں ترکِ تمنّا اب تک
میں بھلا کیسے جیا! مرگ نشاں کیوں نہ ہوا
اَبرِ آوارہ کے مانند نہ بھٹکا کیوں کر
آخرِ شب کے چراغوں کا دُھواں کیوں نہ ہوا
سنگِ طفلاں کا ہدَف کیوں نہ بنا کوچوں میں
چاک داماں سرِبازارِ جہاں کیوں نہ ہوا
جامِ نوشینہ سے کیوں پیاس بجھالی مَیں نے
تلخ آشام سَرِ کوئے مُغاں کیوں نہ ہوا
میری تقصیر کہ بیداد کو بیداد کہا
مَحوِ توصیفِ رُخِ تیغ و سِناں کیوں نہ ہوا

O

میرے سینے میں بھی ہے زخم بہ وَصفِ مَرہم
تُم نے اِس زہر کو چُپ چاپ اُتارا کیسے
کیوں مری دادِ جِنا یاد نہ آئی تُم کو
آئینہ دیکھ کے زُلفوں کو سنوارا کیسے
کیوں دَمِ صبح کرن دِل میں ترازُو نہ ہوئی
چہرۂ شامِ فسردہ ہے گوارا کیسے
مجھ پہ ہنسنے کا کلیجہ بھی ملا نامِ خُدا
کانپ اُٹھتا ہوں کہ دِل تُم نے سہارا کیسے

اب تمہیں ماضیِ مرحوم سے اِنکار بھی ہے
باوَر آتا ہی نہیں، رُوپ یہ دَھارا کیسے

O

بعدِ یک عُمر چلو عقدۂ مُشکل تو کھُلا
رُوح پیاسی تھی، نظر چوُر تھی، دِل تنہا تھے
کوئی حَالات کی زنجیر سے آگے نہ گیا
اپنے تابُوتِ رِوایات میں ہم زندہ تھے
مُدّتوں بعد سَہی آج یہ اقرار کریں
دعویٰ عشق میں ہم دونوں جفا پیشہ تھے

☆☆

نژاد

دِلبندِ جمیل و نُور دِیدہ
اقلیمِ طرب کے شاہزادے
سُورج تری صُبح کا ہَراول
تارے تری رات کے پیادے
مٹھی میں کرن کرن کا سونا
نظروں میں ہیں تتلیوں کے جادے
رنگوں کی جھڑی میں تیری نیندیں
بادل ترے پالنے کا پردہ
شبنم کا خرام تیری لوری
فِطرت کا سکوت تیرا نغمہ
گلکاریاں جیسے سُر کی پتّی
فِطرت کی اَلاپ میں لگی ہو
چہرے پہ صباحتوں کا غازہ
چاندی جیسے پگھل رہی ہو
عارض پہ ہے موتیوں کا پانی
آنکھوں میں شریر مُسکراہٹ
(کیا شئے ہے سکونِ شادمانی)

O

اے عکسِ تصوّراتِ شاعر
سر تا بہ قدم یہ رسمساہٹ
عُمرِ دو جہاں کی سَر خوشی ہے
بے مِنّتِ این و آں یہ ساعت
رُوح و دِل و جاں کی نغمگی ہے
نَے، رنجِ خمار و آہِ دوشیں
نَے، لاگ، نہ مَصلحت، نہ چشمک
نَے، جذب وگُریزِ مطلب آگیں
نَے، تیر کماں میں مُضطرب ہے
نَے، کوئی غنیم ہے مکیں میں
چاندی سی کلائی نُور افشاں
دشنہ کی بجائے آستیں میں
نَے، بیم خزاں نہ فکرِ فردا
اِمروز کی سَلطنت ہے گویا

O

چوگانِ جہاں خراب آباد
ہے بازئ خیر و شَر کا مَامَن
کیا آس نراس کے گوئے ہیں
اُلجھن میں ہیں شاطرانِ پُرفَن
حالات و ضمیر کا تصادم
بَنتا ہے نفس نفس کا رَہزن
کس دَرجہ عجیب زندگی ہے
اِس دَہر میں آدمی دُکھی ہے

O

اے مُجھے فرشتے اے "نژادے"
تُو اپنے چراغِ مہر و مہ سے
مٹی کے دِیوں کو بھی جَلا دے
ہم روشنی کوش منتظر ہیں
ظلمات بدوش منتظر ہیں

☆☆

خوُں بہا

صلیبِ قمر، مقتلِ شب، خموشی
در و بام و ایواں ہیں گُھرے میں غلطاں
کوئ شہر میں داد گر تک نہیں ہے
میں صدیوں سے ہوں، نے بلب، دردساماں
سُنے کون صورِ سرافیلِ تازہ
کہ ہیں پنبہ درگوش شب زندہ داراں

مرا بختِ اسکندری کُوچہ کُوچہ
ہر اِک سنگ سے آئینہ مانگتا ہے
ایاغِ سفالیں کا جمشید حاضر
کوئ نو بہ نو حادثہ مانگتا ہے
میں وہ آبلہ پا ہوں نجدِ دکن کا
ببولوں سے جو خوُں بہا مانگتا ہے

☆☆

قیدِ حیات و بندِ غم

آخرِ شب کی اُداسی، نَم فضاؤں کا سکوت
زخم سے مہتاب کے رِستا ہے کرنوں کا لہُو
دِل کی وَادی پر ہے بے موسم گھٹاؤں کا سکوت
کاش کوئی غمگسار آئے مدا رَاتیں کرے
موم بتّی کی پگھلتی روشنی کے کرب میں
دُکھ بھرے نغمے سُنائے دُکھ بھری باتیں کرے

○

کوئی افسانہ کسی ٹُوٹی ہوئی مِضراب کا
فصلِ گُل میں رائیگاں عرضِ ہُنر جانے کی بات
سِیپ کے پہلوُ سے موتی کے جُدا ہونے کا ذِکر
موَج کی، ساحِل سے ٹکرا کر بکھر جانے کی بات
دیدۂ پُرخُوں سے کاسہ تک کی منزل کا بیَاں
زندگانی میں ہزاروں بار مَر جانے کی بات
عَدل گاہِ خیر میں، پاسنگِ شَر کا تذکرہ
آئینہ خانے میں خال وخَط سے ڈَر جانے کی بات

○

کاش کوئی غمگسار آئے مدارَاتیں کرے
موم بتّی کی پگھلتی روشنی کے کرب میں
دُکھ بھرے نغمے سُنائے دُکھ بھری باتیں کرے

☆☆

غزلیں

ㅇ

غزل کہہ لیں تو جی کا بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے

O

ایک رات آپ نے اُمید پہ کیا رکھا ہے
آج تک ہم نے چراغوں کو جلا رکھا ہے

سوسن و نسترن و سنبل و ریحان و گلاب
تیری یادوں کو گلستاں میں چھپا رکھا ہے

وجہِ آوارگیٔ عشقِ فسردہ معلوم
نگہِ ناز کو پردہ سا بنا رکھا ہے

درد دولت ہی سہی، پہلوئے راحت ہی سہی
کچھ دِنوں عشق نے بھی خود کو بچا رکھا ہے

لے اُڑے اہلِ جنوں حُسن کی اِک ایک اَدا
خَلوت و بزم میں اب فرق ہی کیا رکھا ہے

ہائے خوشبو سے ترے دَرد کی نِسبت نہ گئی
میں نے ہر پھول کو سینے سے لگا رکھا ہے

آج تو شکوۂ محرومیٔ دیدار نہیں
ہم نے کل کے لیۓ اِس غم کو اُٹھا رکھا ہے

☆☆

O

حیات راس نہ آئے اَجل بہانہ کرے
ترے بغیر بھی جینا پڑے خُدا نہ کرے

میں روز مرتا ہوں اِس انتظار کے صدقے
بُرا نہ مان اگر زندگی وفا نہ کرے

ہم ایک ہوگئے دو دِن میں کس طرح اللہ
یہی دُعا ہے کوئی تیسرا جُدا نہ کرے

منایا جشنِ شبِ غم کہ ایک دِن تو کٹا
جو تجھ سے چھوٹ کے جیتا رہے وہ کیا نہ کرے

میں اپنی روشنئ طبع سے لرزتا ہوں
بُرا جنوں مجھے منزل سے آشنا نہ کرے

میں کیا بتاؤں کہ قربت کا فاصلہ کیا ہے
کہ جیسے گھر تو بنائے کوئی رہا نہ کرے

☆☆

O

خواب کے دُھندلے شہر میں اکثر اِک پرچھائیں پھرتی ہے
یوں نہ ستا اے صورتِ مبہم ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے

○

زنجیرِ گُل و لالہ چپکے سے ہلا دینا
اے بادِ بہار اپنی آمد کا پتا دینا

آساں بھی نہیں تیرا یُوں دِل سے بھلا دینا
اچھا بھی نہیں اتنا شعلوں کو ہَوا دینا

پھر ٹھنڈی ہوا آئی پھر بُوئے وَفا آئی
اے ضَبط کہیں اَپنا وعدَہ نہ بھُلا دینا

تخصِیص نہیں باقی اُس چشمِ عنایت کی
ہر ایک کے بَس میں ہے اب دِل کو دُکھا دینا

یہ چشمِ تصوّر تو جینے ہی نہیں دیتی
آیا نہیں فُرقت کو دُوری کی سزا دینا

ہم شاؔذ سے سیکھیں گے زخموں کی چَمن بندی
کچھ دل کو لہُو کرنا کچھ پھُول کھِلا دینا

☆☆

O

ہوسِ جلوہ نہیں ذوقِ تماشا بھی نہیں
کسی چہرے پہ ترے چہرے کا دھوکا بھی نہیں

غمگساری کی توقع نہ دِلاسہ کی اُمید
کیا قیامت ہے کہ میں عشق میں رُسوا بھی نہیں

وہی مِل بیٹھنا پہروں وہی احباب کی بزم
خود فریبی کا بھلا ہو کہ میں تنہا بھی نہیں

حُسن سَر تا پا تغافل ہے روایت کے بِنار
تجربہ اَپنا یہ کہتا ہے کہ ایسا بھی نہیں

سامنا ہو تو وہی بوجھ سَا جیسے دِل پر
تم سے مانا کہ کسی بات کا پَردا بھی نہیں

آگے آگے کوئی مشعَل سی لیئے چلتا تھا
ہائے اُس شخص کا کیا نام تھا پوچھا بھی نہیں

صرف خَلوت کی ہے شوخی کہ ابھی تک اُس نے
شاذؔ کہہ کر مجھے محفل میں پکارا بھی نہیں

☆☆

O

دامان و آستیں کی ضیافت نہ کر سکے
ہم اہتمامِ گریۂ خلوت نہ کر سکے

دامن سے اپنے تُم نے بُجھایا چراغِ دِل
تم وہ نہیں کہ مجھ پہ عنایت نہ کر سکے

تُجھ سا ہجُوم دہر میں گو ڈھونڈتے رہے
جب تُو ملا تو تُجھ سے محبت نہ کر سکے

کچھ دسترس سے دُور نہ تھا دامنِ حبیب
طے عمر بھر مگر یہ مسافت نہ کر سکے

شُکرِ کرم پہ ختم ہوئی گفتگوئے شوق
اِک رنج رہ گیا کہ شکایت نہ کر سکے

☆☆

O

پھرتی ہے جنوں کی رُت شاید، آتی نہیں بُوئے پیراہن
کچھ دن سے نگاہوں میں تیری تصویر بدلتی جاتی ہے

O

حیاتِ نَو بہ نَو کے ساتھ غَم ملے نئے نئے
ہماری صبح و شام کے ہیں سلسلے نئے نئے

شکستہ پا کی شرم رکھ لے اے غُبارِ کارواں
کہیں اُسے نہ دیکھ پائیں قافلے نئے نئے

جبینِ سَجدہ جُستجوئے خُوب تَر میں مِٹ گئی
سُراغ تیرے نقشِ پا کے یُوں ملے نئے نئے

ترا کرم کہ زندگی اُداس ہو کے رَہ گئی
ہیں وَرنہ شادمانیوں کے سلسلے نئے نئے

تمہیں خبر نہیں ہوئی چَمن سے تُم چلے گئے
پسِ بہارِ آرزُو بھی گُل کِھلے نئے نئے

نفس نفس میں نشترِ فراق ٹُوٹتے گئے
قدم قدم پہ غمگسار بھی ملے نئے نئے

ہمیں نشاطِ دِید جیسے آج بار ہو گئی
نِکل رہے ہیں قُربتوں میں فاصلے نئے نئے

اُٹھا تو آہ کب اُٹھا وہ حشرِ بازدید بھی
دہانِ زخمِ دِل تھے شاذ جب سِلے نئے نئے

☆☆

O

شکرِ کرم بھی شکوۂ غم بھی، سارے عُنواں آپ ہُوئے
مجھ پہ توجہ آپ نے کی تھی، مجھ سے گریزاں آپ ہُوئے

دستِ طلب کب میں نے بڑھایا کچھ نہ ملا تو شکوہ کیا
کیوں میرے دامانِ تہی پر اِتنے پشیماں آپ ہُوئے

خاکِ دشتِ وفا تھی رُخ پر وَرنہ کوئی بات نہ تھی
آئینہ اپنا دُھندلا پاکر کتنے حیراں آپ ہُوئے

اُف یہ تواضع، ہائے یہ خاطر کوئی بھلا کس دل سے کرے
عُمر تمام جہاں رہنا تھا اُس گھر مہماں آپ ہُوئے

آپ کے دَم سے شاؔذ کا فن ہے، حُسنِ بَیاں ہے، رنگِ سُخن ہے
نام ہمارا چل نکلا ہے صاحب دیواں آپ ہُوئے

☆☆

O

شب و روز جیسے ٹھہر گئے کوئی ناز ہے نہ نیاز ہے
ترے ہجر میں یہ پتہ چلا مِری عُمر کتنی دَراز ہے

O

اے جنوں دشت میں دیوار کہاں سے لاؤں
میں تماشا سہی بازار کہاں سے لاؤں

یادِ ایام کہ کچھ سر میں سمائی تھی ہوا
اب وہ ٹوٹا ہوا پندار کہاں سے لاؤں

کس سے پوچھوں کہ مرا حالِ پریشاں کیا ہے
تجھ کو اے آئینہ بردار کہاں سے لاؤں

میری اِن آنکھوں نے جیسے تجھے دیکھا ہی نہیں
ہائے وہ حسرتِ دیدار کہاں سے لاؤں

اُن نگاہوں میں ترسنے کی سی کیفیت ہے
طاقتِ پرسشِ بیمار کہاں سے لاؤں

اب مرے کفر کو ایماں نہیں کہتا کوئی
تجھ کو اے چشمِ طرفدار کہاں سے لاؤں

تھا یہ گھر بابِ دعا، مثلِ اثر تیرا ورود
اب تجھے اے قدمِ یار کہاں سے لاؤں

☆☆

O

ہُنرِ شوق کو پھر درد میں ڈھل جانے دے
ضبطِ غم اُس کی طرف لے کے غزل جانے دے

اُن نگاہوں کا تقاضا بھی ہے اے گردشِ چرخ
میں بھی کہتا ہوں کہ اب مُجھ کو سنبھل جانے دے

خاک ہوکر ترے کُوچے سے اُٹھا ہے کوئی
اُس کو دعویٰ ہے بہلنے کا بہل جانے دے

منزلِ یاس ترے قول و قسم مان گئے
آج رُک جائیں گے لیکن ہمیں کل جانے دے

اب اگر مِل تو کچھ اِس طرح مِل اے پیکرِ لُطف
قُرب و دُوری کی روایت کو بدل جانے دے

پھر مِرا مہر مجھے ڈھونڈ نہ لے اے شبِ غم
صُبح سے پہلے کہیں دُور نِکل جانے دے

میں گنہ گارِ وفا دِل ہے جہنّم کا عذاب
رحم اے آہ نہ کر شاذ کو جَل جانے دے

☆☆

○

خارزاروں کا بھلا ہو، حوصلہ دینے لگے
آبلے منزل کی دُوری کو دُعا دینے لگے

مصلحت اندیشی ترکِ محبت ہائے ہائے
بُو الہوس بھی اب ہمیں درسِ وفا دینے لگے

کیا نکالی ہم نے ترکیبِ چمن بندیٔ دہر
آدمی کو آدمی کا واسطہ دینے لگے

اب سنور جا کا گُلِ ہستی سنور جا رحم کر
وقت کے ہاتھوں میں لمحے آئینہ دینے لگے

ہے تمہارے ہاتھ میزانِ کم و کیفِ حیات
تُم بھلا کیوں سانس لینے پر سزا دینے لگے

میں گنہ گارِ وفادِل ہے جہنم کا عذاب
رحم اے آہ نہ کرشاذ کو جل جانے دے

رفتہ رفتہ اُس کی باتیں دِل میں گھر کرتی گئیں
آخر آخر اُس کے قصے دُکھ سوا دینے لگے

پھُول چُنتے چُنتے ہم بھی آنسوؤں تک آگئے
وہ بھی پہلوئے طربِ میں غم کو جا دینے لگے

یوں ملے ہنس ہنس کے ہر اک سے تمہارے بعد ہم
جیسے قتلِ آرزو کا خوں بہا دینے لگے

شاذ اب ارضِ دکن لو دے اُٹھی ہے چل پڑو
کُوچہ ہائے شہرِ صحرا کا پتہ دینے لگے

☆☆

O

آنکھ اور ہنستی رہے وقتِ وداعِ دوست پر
اِس وفورِ ضبطِ کامل کو کہاں تک روئیے

O

جوہرِ چہرہ شناسی نہیں آئینہ میں
اپنی بھولی ہوئی تصویر پہ رونا آیا

O

راتیں نشیلی دِن ہیں سُہانے — حُسن منائے عشق نہ مانے
تیز ہوا ہے لَوٹ بھی جاؤ — کیوں آئے ہو دیپ جَلانے
ہم نے آگ بہت پی لی ہے — گُلشن میں شبنم کے بہانے
چاک نہ کرلیں جیب تصوّر — کب ہیں اپنے ہوش ٹھِکانے
عشق و وَفا کا بار بہت ہے — دَرد سے بوجھل حُسن کے شانے
کیوں کھائیں گے عشق کا دھوکہ — ہم بھی سیانے تُم بھی سیانے
کیسی مجھے جینے کی ہوس ہے — صبح نہ جانے شام نہ جانے
کِس کِس سے ہنس بول لیئے ہم — تنہائی کے ناز اُٹھانے
کل پھِر شاید یوُں نہ دُکھے دِل — وقت ہے رولے آج دوانے
کون کھڑا تھا جوئے اَزل پر — اپنے لُہو میں آپ نہانے
عُمر کی رات آنکھوں میں کٹی ہے — جاگ رہا تھا کوئی سَرہانے

نغمۂ نَو پھِر شآذ نے چھیڑا
جاگ اُٹھے پھِر دَرد پرُانے

☆☆

O

قصۂ شوق کے عنوانِ دِل آرام کئی
میں نے کس پیار سے رکھے ہیں ترے نام کئی

ٹکٹکی باندھ کے بس دُور سے تکتے رہنا
وصل میں ملتے ہیں اب ہجر کے آلام کئی

عقدۂ جاں کو ہے ابتک ترے ناخن سے اُمید
کس کو معلوم اُدھورے ہیں مرے کام کئی

دِل زندہ سے ہے یہ گرمیٔ بازارِ حیات
سَرِ سودا زَدہ قائم ہے تو اِلزام کئی

وَادیٔ سَنگ سے انجان گزرنے والے
نا تراشیدہ رہے جاتے ہیں اَصنام کئی

کچھ نہ کچھ کہتی تھی وہ آنکھ دمِ رخصتِ شوق
لے کے اُٹھا ہوں کسی بزم سے اَوہام کئی

جیسے ہر ایک دریچہ میں ترا چہرہ ہو
یوُں مرے حال پہ ہنستے ہیں دَر و بام کئی

شاذؔ اب اُس کی خموشی کو دُعا دینا ہے
جس نے بھیجے تھے مجھے نامہ و پیغام کئی

☆☆

○

کِس کِس کو اب رونا ہوگا جانے کیا کیا بھُول گیا
چشم و لَب کا ذِکر ہی کیا ہے، میں تو سَراپا بھُول گیا

اُس نے تو شاید بادِ صَبا سے نامۂ خُوشبو بھیجا تھا
اُس کو خبر کیا مجھ کو چمن کا پتہ پتہ بھُول گیا

شہرِ شب میں اپنی فقط اِک نجمِ سَحر سے یاری تھی
ہم کچھ ایسے سوئے وہ بھی رفتہ رفتہ بھُول گیا

آبلہ پَا ہوں، آپ اپنے ہی نقشِ قدم سے ڈرتا ہوں
تنہا تنہا پھرتے پھرتے اپنا سَایہ بھُول گیا

شاذؔ سے پُوچھو او سَودائی کس کی دُھن میں پھرتا ہے
کس کی باتیں یاد آتی ہیں کس کا چہرہ بھُول گیا

☆☆

○

لوگ کیا جانیں مری خوئے اذیت طلبی
تجھ پہ تہمت ہے کہ تونے مجھے برباد کیا

○

نکہتِ گُل ہو پر اَفشاں خلشِ خار کے ساتھ
چاہیئے صلح کا انداز بھی پیکار کے ساتھ

زندگی یوں بھی ہے دُشوار، نہ یاد آ، تجھ پر
سب عیاں ہے مری ناکامی اظہار کے ساتھ

شہر میں بندشِ اَربابِ خرد تھی وَرنہ
ظلم کر بیٹھتے دَامانِ دلِ زار کے ساتھ

حافظہ آج بھی دہراتا ہے اُن راتوں کو
شمع رو پڑتی تھی جب صبح کے آثار کے ساتھ

ہم سے پوچھے کوئی فطرت کی عبادت کے مزے
جھک گئے سجدے میں ہر شاخِ ثمر بار کے ساتھ

دلِ ناکام کے اَرماں بھی بہت ہنس مکھ تھے
چلو اچھا ہے گئے ایک ملنسار کے ساتھ

تم خدا بھی نہ تھے، پتھّر بھی نہ تھے، آنسو تھے
کب سے وابستہ ہو دامن کے ہر اِک تار کے ساتھ

اُس کے دامن کا خدا جانے کنارا ہے کہاں
جس نے اِنصاف کیا دیدۂ خوں بار کے ساتھ

قفسِ رنگِ تمنا کا کوئی باب نہ تھا
زندگی کاٹ دی ہم نے در و دیوار کے ساتھ

O

دیارِ غیر میں شاید سنبھل گئے ہوتے
ہم ایک بار وطن سے نکل گئے ہوتے

کھلا یہ راز کہ ہم صورتِ جہنّم ہیں
چراغ ہوتے تو شب بھر میں جل گئے ہوتے

کہاں کا بارِ امانت اُٹھائے پھرتے ہیں
ازل کی صبح کوئی چال چل گئے ہوتے

تمہاری خوئے وفا سے بھی ہے گلہ کیا کیا
زمانہ بدلا تھا تم بھی بدل گئے ہوتے

سنا کہ ذکرِ وفا پر نکل پڑے آنسو
تم ان کی بزم میں اے شاذؔ کل گئے ہوتے

☆☆

O

آہ دیکھی ہے اَثر جانا ہے
آج آئینہ سے ڈر جانا ہے

اُس حیا بخت کو کھلنا ہے ضرور
زُلف کو تابہ کمر جانا ہے

زندگانی کا قرینہ مت پوچھ
ہم نے دیوار کو دَر جانا ہے

آبلہ پائی کی یہ رسمِ عجیب
ایک اِک گام پہ ڈر جانا ہے

شہر سے قصدِ سفر ہے اپنا
تم پکارو تو ٹھہر جانا ہے

یہ بھی دن تھا مری قسمت میں کہ آج
اپنی اُلفت سے مکر جانا ہے

ایک ایسا بھی زمانہ گزرا
ہم نے سوچا تھا کہ مر جانا ہے

سانس لیں زخم کا ٹانکا نہ کھلے
ہم نے بس اِتنا ہنر جانا ہے

☆☆

O

میری وحشت کا ترے شہر میں چرچا ہوگا
اب مجھے دیکھ کے شاید تجھے دھوکا ہوگا

صاف رستہ ہے چلے آؤ سوئے دیدہ و دل
عقل کی راہ سے آؤ گے تو پھیرا ہوگا

کون سمجھے گا بھلا حُسن گریزاں کی ادا
میرے عیسیٰ نے مرا حال نہ پوچھا ہوگا

وجہ بے رنگی ہر شام و سحر کیا ہوگی
میں نے شاید تجھے ہر رنگ میں دیکھا ہوگا

اب کہیں تُو ہی ڈبوئے ہمیں اے موجِ سراب
ورنہ پھر شکوۂ پایابیٔ دریا ہوگا

کوئی تدبیر بتا اے دلِ آزار پسند
اُس کو جی جاں سے بھلانے میں تو عرصہ ہوگا

حُسن کی خلوتِ سادہ بھی ہے صد بزم طراز
عشق محفل میں بھی ہوگا تو اکیلا ہوگا

جُھٹپٹا چھایا ہے کون آیا ہے دروازے پر
دیکھنا شاذؔ کوئی صبح کا بھولا ہوگا

☆☆

O

بے سجدہ نہیں گزرا بُت خانۂ عالم سے
کیا کہیے محبت میں کس درجہ اَدب آیا

O

سنبھل اے قدم کہ یہ کارگاہِ نشاط و غم ہے خبر بھی ہے
جسے لوگ کہتے ہیں رہگذر کسی پاشکستہ کا گھر بھی ہے

مجھے مدّتوں یہی وہم تھا کہ یہ خاک کیمیا بَن گئی
اِسی کشمکش میں گذر گئی کہ فغاں کروں تو اَثر بھی ہے

ہمہ اِنکسار کی کیفیت، ہے دمِ وداع کی بے بسی
مجھے یوں پیامِ سکوں نہ دے تجھے اپنے آپ سے ڈر بھی ہے

مری جرأتوں پہ بھی کر نظر، تجھے چاہوں سو دفعہ ٹوٹ کر
یہ بجا کہ سینۂ شوق میں غمِ پاسبانیٔ در بھی ہے

تجھے آگہی کی نہیں خبر، مری گمرہی پہ نہ طنز کر
ارے وقت وقت کی بات ہے یہی عیب رشکِ ہُنر بھی ہے

کوئی اس کا دَرد بھی پوچھتا کہ وہ کچھ دنوں سے اُداس ہے
یہ جنوں کی پرسشِ حال کیا جو ازل سے خاک بسر بھی ہے

یہ ہے بے گناہی کا ماجرا، کوئی یونہی مجھ سے کھنچا رہا
یہی سوچ سوچ کے رَہ گیا کہ مرے خدا کو خبر بھی ہے

تجھے کھو کے گو میں سنبھل گیا، یہ نہ کہہ کہ شاذؔ بدل گیا
پسِ پردہ تیری پناہ میں، مری شام بھی ہے سحر بھی ہے

☆☆

O

نَے بادِ صبا ہے نہ نسیمِ سحری ہے
سو پردوں سے لیکن تری آواز سُنی ہے

O

رنگ اُڑتا ہوا بکھرے ہوئے گیسو تیرے
ہائے وہ رات کے تھمتے نہ تھے آنسو تیرے

کیا خبر کون سی وادی میں ہے محمل تیرا
جانے کس دشت میں گم ہوگئے آہو تیرے

سازِ اقرار میں تھی نغمۂ انکار کی گونج
آنکھ جھکتی رہی کھنچتے رہے ابرو تیرے

زُلف وابستہ نے کیا کیا نہ مچائیں دھومیں
جوشنِ گل سے جو باندھے گئے بازو تیرے

اَگلے وقتوں کی سی تہذیب ہے پہناوے میں
پھر بھی سو طرح سے بول اُٹھتے ہیں جادو تیرے

کچھ بتا پیکرِ تقدیس حیا، صبح ازل
کن بہانوں سے تراشے گئے پہلو تیرے

ہم کہاں ڈھونڈنے جائیں تجھے اے تشنہ دہن
اب فقط نقشِ کفِ پا ہیں لبِ جو تیرے

☆☆

O

ہائے یہ نامۂ گل کس نے ہمیں بھیجا ہے
ہر کفِ برگ کی تحریر پہ رونا آیا

O

خود اپنا حالِ دلِ مُبتلا سے کچھ نہ کہا
دُعا سے ہاتھ اٹھائے خدا سے کچھ نہ کہا

کسے سُناؤں کہ ناساز ہے جُنوں کا مزاج
خود اپنے شہر کی آب و ہَوا سے کچھ نہ کہا

یہ کس سے عشق ہوا، کیوں ہُوا، تعجب ہے
وہ خوف ہے کہ کسی آشنا سے کچھ نہ کہا

یہ ہوش ہے کہ گذر جائے گی پھوار کی رُت
مگر یہ زعم کہ اُودی گھٹا سے کچھ نہ کہا

ترے خرام کو دیکھا بہ چشمِ حسرت و یاس
تمام عُمر ترے نقشِ پا سے کچھ نہ کہا

کھُلے تو کیسے کھُلے رازِ عُنفوانِ شباب
حَیا نے کیا ترے بندِ قبا سے کچھ نہ کہا

وہ کیا اَدا تھی کہ لہلوٹ ہو گئے تم شاذؔ
غضب کیا، اُسی جانِ اَدا سے کچھ نہ کہا

☆☆

O

تُم گلستاں سے نہ جاؤ یہ سِتم ہے دیکھو
پھول کا واسطہ خوشبُو کی قسم ہے دیکھو

پھر وہی ساعتِ دیدارِ نشاط آئی ہے
پھر وہی سلسلۂ رَنج و اَلم ہے دیکھو

لاکھ بے مایہ سہی جنسِ گراں ٹھہرے گا
دِل بھی ٹُوٹا ہوا پیمانۂ جَم ہے دیکھو

دَیرِ افروز رُخِ خندہ بَلب دیکھا ہے
میری نمناک نگاہوں کا حَرم ہے دیکھو

یاد آتا ہے سَرِ جام کِسی کا کہنا
تُم نہ پینا مِری آنکھوں کی قَسم ہے دیکھو

یہی آدابِ تمنّا، یہی تہذیبِ وَفا
ساعتِ وصل بھی شائستہ غم ہے دیکھو

نامۂ ترکِ وَفا اور یہ اَلقاب اس کا
کیا عبارت ہے یہ کیا حُسنِ رقم ہے دیکھو

یہ اُفق تابہ اُفق ڈھونڈتے پھرتے ہو کسے
عرصۂ دَہر بھی اِک نقشِ قدم ہے دیکھو

اب جو اِک رَبط سا باقی ہے محبت تو نہیں
یہ حقیقت میں محبت کا بھرم ہے دیکھو

یہ جو کچھ نُور سا چھنتا ہے کفِ بُت گر سے
میری محرابِ تخیّل کا صَنم ہے دیکھو

کوئی صُورت مُجھے دیدو کہ ترستا ہوں مَیں
میری تعمیر کی مٹّی ابھی نَم ہے دیکھو

☆☆

O

سُکونِ بے حِسی نے آخرش سمجھا دیا ہم کو
اُداسی بھی بڑی توفیق تھی دردِ محبت میں

○

خود فریبی کا تقاضا کیا تھا
آئینہ سے مرا جھگڑا کیا تھا
کیا دیا مجھ کو زمانے نے جواب
میں نے کیا جانیۓ پوچھا کیا تھا
آگ روشن تھی سرِ خیمۂ دِل
رات ہنگامہ بپا تھا کیا تھا
لُو سے تپتے ہوۓ صحراؤں میں
ایک ٹھہرا ہوا دریا کیا تھا
زہر صہبا تو نہیں تھا ساقی
زندگی کا مجھے ہوکا کیا تھا
یاد آۓ تو یہ دامن تر ہو
یاد گر آتی تو رونا کیا تھا
سینۂ ساز میں پَو پھٹتی تھی
آخرِ شب کا وہ نغمہ کیا تھا
صبحِ گُل کا شبِ گیسو میں سماں
وہ اُجالا وہ اندھیرا کیا تھا
ایک تائید سی سرتا بہ قدم
صاف وعدہ تھا سراپا کیا تھا

ق

تجھ سے اے لالۂ صحرائے خیال

سوچتا ہوں مرا رشتہ کیا تھا

روحیں ہمسایہ تھیں شاید اپنی

خود پہ ہمزاد کا دھوکا کیا تھا

اوّل اوّل وہ تکلّف وہ سلام

پسِ پردہ ترا جلوہ کیا تھا

صرف آواز سنانے کی ادا

کون سمجھے گا دلاسا کیا تھا

تو گرفتارئ خود بیں کیا تھی

وہ سن و سال کا پہرا کیا تھا

نیند چبھتی تھی تری آنکھوں میں

شام سے صبح کا دھڑکا کیا تھا

اُف وہ لفظوں کا دعا ہو جانا

ہائے وہ اگلا زمانا کیا تھا

وجہ آغازِ محبت کیا تھی

سببِ رنجشِ بے جا کیا تھا

☆☆

O

وہ کامرانیاں وہ کھیل سب نصیب کے تھے
عجیب دَور تھا ہم مُنتظر رقیب کے تھے

مجھے خزاں سے ملی تھی نویدِ موسمِ گُل
جو برگِ خشک تھے نامے مرے حَبیب کے تھے

ہَوس نے کرلیئے تعمیر قصر ہائے وَفَا
میں کیا بتاؤں یہ اَرماں کسی غریب کے تھے

تراش لی ہے گلستاں میں شاخِ نغمۂ نَو
بہت دِنوں سے تقاضے بھی عندلیب کے تھے

یہ اور بات کہ نظروں سے ہوگئے اوجھل
ہمارے فاصلے لیکن بہت قریب کے تھے

اُداس رات کڑے کوس عِشقِ تنہا کے
وہ سنگِ میل سے راہوں میں سب صلیب کے تھے

☆☆

O

اپنی اپنی شبِ تنہائی کی تنظیم کریں
چاندنی بانٹ لیں مہتاب کو تقسیم کریں

میں یہ کہتا ہوں کہ مجھ سا نہیں تنہا کوئی
آپ چاہیں تو مری بات میں ترمیم کریں

ابنِ آدم مجھے رسوا سرِ بازار کرے
اور سرِ عرش فرشتے مری تعظیم کریں

بے غرض عشق ہے یہ اہلِ جہاں کہتے ہیں
کچھ غرض مند بھی ہوتا ہے یہ تسلیم کریں

عشق اکیلا ہے تو کیا حُسن بھی تنہا ہوگا
ہجر وہ درد نہیں ہے جسے تقسیم کریں

☆☆

O

ہم بھی ہشیار نہ تھے پیار بھی پاگل کی طرح
بات پھیلی ہے تری آنکھ کے کاجل کی طرح

چار سُو سَیلِ ہَوا بھی ہے سَنبھلنا بھی ہے
زِیست بھی ہے ترے اُڑتے ہوئے آنچل کی طرح

اپنے دَم سے ہے اُمنگوں کی صَلیب آرائی
سرِ سودا ہے چراغِ سَرِ مَقتل کی طرح

اپنی تقدیر میں فَردَا کا تصوّر ہی نہیں
ہم گنہ گارِ حیات آج بھی ہیں کل کی طرح

عُمر گھٹتی ہے کہ بڑھتی ہے ہمیں کیا معلوم
ہم جیئے جاتے ہیں اِک مرگِ مُسلسل کی طرح

رات سی رات ہے، برسات ہے، تنہائی ہے
کُوکتا ہے مِرے دِل میں کوئی کوئل کی طرح

مَیں کہ بادیدۂ حَسرت ہُوں سَرِ کِشتِ وَفَا
ختمِ باراں کے گُزرتے ہوئے بادل کی طرح

خندہ رُو بھی ہوں مگر زخم کے مانندِ شگاف
دِل بھی شاداب ہے لیکن کسی جنگل کی طرح

☆☆

○

پاسِ آداب سے یا حُسنِ مُروّت سے ملے
وہ کہاں ملتے ہیں وہ تو مِری قسمت سے ملے

شادمانی سے رہ و رسم ہی کیا تھی پھر بھی
ہم ملے بھی تو ترے غم کی رعایت سے مِلے

خبرِ وحشتِ جاں اوّل و آخر ہے زیاں
گھر کی وُسعت سے ہو یا دشت کی وسعت سے مِلے

جی میں ہے حسرتِ اظہارِ بیاں کیا کیا کچھ
اے حیاتِ گُزراں تُو کہیں فرصت سے مِلے

کوئی سونپی ہوئی شے جیسے گنوا بیٹھے ہیں
آج اپنے سے ملے ہم تو ندامت سے مِلے

شہر میں اب نہ کوئی دوست نہ دشمن اپنا
ہائے وہ لوگ کہ جن سے تری صورت سے مِلے
چند لمحوں کی مُلاقات کا کیا نام ہے شاذ
یعنی ہم روز ملے روز ہی حَسرت سے مِلے

☆☆

○

مہک سے جس کی مُعطّر ہے دِل وہ پھول کہاں
کھٹک رہا ہے جو سینے میں خار بھی تو نہیں

O

کہیں بیٹھوں کہیں بہل جاؤں
کیا کروں کس طرف نِکل جاؤں

وقت بدلا زمانہ بدلا ہے
ہائے میں کس طرح بدل جاؤں

اے نشیب و فرازِ راہِ وفا
تُو بتا، گر پڑوں، سنبھل جاؤں

کیسے کیسے کھلونے ٹوٹ گئے
جن کو دیکھو تو پھر مچل جاؤں

میں کہ ہوں رازِ آتشیں بہ کنار
مُنہ سے بولوں اگر تو جل جاؤں
دشتِ غربت اگر سہارا دے
بخدا شاذؔ سر کے بل جاؤں

☆☆

O

کیوں شمع سرِ رہگذرِ باد جلی ہے
یہ رسمِ وفا ہے تو اُٹھا کیوں نہیں دیتے

○

دَشت کیا شئے ہے، جُنوں کیا ہے، دِوانے کے لیئے
شہر کیا کم ہے مجھے خاک اُڑانے کے لیئے

ہم نے کیا جانیئے کیا سوچ کے گُلشن چھوڑا
فصلِ گُل دیر ہی کیا تھی ترے آنے کے لیئے

میں سَرائے کے نگہباں کی طرح تنہا ہوں
ہائے وہ لوگ کہ جو آئے تھے جانے کے لیئے

ہَم وہی سوختہ سامانِ اَزل ہیں کہ جنہیں
زندگی دُور تک آئی تھی مَنانے کے لیئے

دِل کی محراب کو درکار ہے اِک شمع فقط
وہ جَلانے کے لیئے ہو کہ بُجھانے کے لیئے

تُو مِری یاد سے غافِل نہ تِری یاد سے مَیں
ایک دَر پردَہ کشاکش ہے بُھلانے کے لیئے

ضبطِ پیَہم کے نثارؔ اے دلِ آزار طلب
شرطِ دامن بھی اُٹھا اشک بَہانے کے لیئے

سُن مجھے غور سے سُن، نغمۂ ناپیدا ہُوں
کوئی آمادہ نہیں ساز اُٹھانے کے لیئے

حرفِ ناگفتہ کی رُوداد لیئے پھرتے ہیں
پہلے کہتے تھے غزل اُن کو سُنانے کے لیئے

دِل کہ دریوزہ گرِ حرفِ تسلّی نہ رہا
ہم نے یہ رَسم اُٹھا دی ہے زمانے کے لیئے

سانس روکے ہوئے پھرتا ہوں بھرے شہر میں شاذؔ
اُس نے کیا راز دیا مجھ کو چھپانے کے لیئے

☆☆

O

بُت ساز نہیں ہوں میں خدا ساز ہوں شاید
وہ آگ جو سینے میں ہے پتھر میں نہیں ہے

O

جانے والے تجھے کب دیکھ سکوں بارِ دگر
روشنی آنکھ کی بہہ جائے گی آنسو بن کر

تُو حصارِ در و دیوار لیے جائے کدھر
میرا کیا ہے کہ میں ہوں دشت بہ دِل خانہ بہ سَر

کون جانے مری تنہائی پسندی کیا ہے
بس ترے ذکر کا اندیشہ ترے نام کا ڈر

یوں بھی اشکوں کا دھندلکا تھا سُجھائی نہ دیا
کس نے لوٹا دمِ رخصت سروسامانِ سفر

کس نے دیکھا ہے مرا شہرِ خموشانِ حیات
دِل کی وادی سے گزرنا ہے تو آہستہ گذر

رو رہا ہوں کہ ترے ساتھ ہنسا تھا برسوں
ہنس رہا ہوں کہ کوئی دیکھ نہ لے دیدۂ تر

یہ مری زخم نصیبی یہ تری حیرانی
میں نے تیرے ہی اشارہ پہ توڑالی تھی سپر

ٹُوٹ جائے گا نشہ دیکھ کوئی نام نہ لے
آنکھ بھر آئے گی اِس طرح مِرا جام نہ بھر

کوئی گُم گشتہ ہر آغازِ سفر سے پہلے
چوُم لیتا ہے تِری یاد کا بھاری پتّھر

میں نے ہر رات یہی سوچ کے آنسو پونچھے
مُنہ دکھانا بھی ہے دُنیا کو بہ ہنگامِ سحر

شاذؔ کو صبر عطا کر کے بڑا کام کیا
اُس نے کیا مانگا تھا، کیا پایا ہے اے ربِّ ہُنر

☆☆

O

وعدہ و قول و قسم نے مجھے جینے نہ دیا
کیا ستم ہے کہ کرم نے مجھے جینے نہ دیا

دِل تو آمادۂ غم تھا بہ ایں بربادیٔ جاں
مگر اندازۂ غم نے مجھے جینے نہ دیا

ناز بردارِ سوالِ دِلِ پُرخوں نہ ملا
کاسۂ دیدۂ نم نے مجھے جینے نہ دیا

تُو جفا پیشہ ہے کس مُنہ سے کہوں دُنیا سے
اپنی چاہت کے بھرم نے مجھے جینے نہ دیا

ایک نادِیدہ خُدا نے مِرے نالے نہ سُنے
ایک پتھر کے صَنم نے مجھے جینے نہ دیا

ایک سایہ کا کرم ہے تپشِ جاں پہ ہنوز
ایک دیوار کے خَم نے مجھے جینے نہ دیا

شعر لکھتا ہوں کہ تقدیرِ تمنّا اے شاذؔ
ہُنرِ لَوح و قلم نے مجھے جینے نہ دیا

☆☆

O

جس طرف جاؤں اُدھر عالم تنہائی ہے
جتنا چاہا تھا تجھے اتنی سزا پائی ہے

میں جسے دیکھنا چاہوں وہ نظر آ نہ سکے
ہائے اِن آنکھوں پہ کیوں تہمتِ بینائی ہے

بارہا سرکشی و کج کلہی کے باوصف
تیرے در پر مجھے دریوزہ گری لائی ہے

صدمۂ ہجر میں تو بھی ہے برابر کا شریک
یہ الگ بات تجھے تابِ شکیبائی ہے

بھولنے والے نے شاید یہ نہ سوچا ہوگا
ایک دو دِن نہیں برسوں کی شناسائی ہے

جامِ خوش رنگ تہی ہے، مجھے معلوم نہ تھا
اپنی ٹوٹی ہوئی توبہ پہ ہنسی آئی ہے

یہ توجہ بھی تری حُسنِ گریزاں کی طرح
یہ تغافل بھی مری حوصلہ افزائی ہے

تیرا لہجہ ہے کہ سناٹے نے آنکھیں کھولیں
تیری آواز کلیدِ درِ تنہائی ہے

شاذؔ پوچھو کہ یہ آنکھوں کا دُھندلکا کب تک
رات آئی نہیں یا نیند نہیں آئی ہے

☆☆

O

یہ زندگی عجیب ہے اب تجھ سے کیا کہیں
سچ ہے ترا خیال کبھی تھا کبھی نہ تھا

O

شمع کو نذرِ سَرِ یاد کہاں کرتا ہوں
یہ ترا دَرد ہے برباد کہاں کرتا ہوں

زیرِ محرابِ فلک دستِ دُعا ٹُوٹ گئے
میرے اللہ میں فریاد کہاں کرتا ہوں

تُو وہ مجبور، تری آہ پہ پابندی ہے
میں وہ محرُوم، تجھے یاد کہاں کرتا ہوں

خانۂ دِل ہے، کوئی خانۂ کعبہ تو نہیں
اپنا گھر ہے مگر آباد کہاں کرتا ہوں

یُوں بھی رہتی ہے مجھے خاطرِ احباب عزیز
آپ ناشاد ہوں، ناشاد کہاں کرتا ہوں

سُننا پڑتا ہے مُجھے ہوش و جنوں کا جھگڑا
ایک زنجیر ہے آزاد کہاں کرتا ہوں

☆☆

○

رنگ لایا مِرا بے برگ و نوا ہو جانا
اِتنا آسان نہ تھا اُس کا خُدا ہو جانا

کون آوازِ جرس بَن کے رہا محملِ ناز
کس کی قسمت میں ہے صَحرا کی صَدا ہو جانا

حشر تک بے گنہی ناز کرے گی مجھ پر
وہ مِرا تیری نگاہوں میں بُرا ہو جانا

مجھ پہ وہ وقت پڑا ہے کہ شکایت کیسی
تجھ کو لازم تھا بہرحال خفا ہو جانا

میری تقدیر پہ تُہمت ہی اُٹھائی جاتی
تجھ کو زیبا نہ تھا یُوں خود سے جُدا ہو جانا

آج تک یاد ہے کیفیّتِ جاں تیرے حُضور
سَر سے پا تک وہ مِرا دستِ دُعا ہو جانا

شاؔذ کانپ اُٹھے مِرے ترکِ محبت کے قدم
وہ کسی پرسِشِ پنہاں کا بَلا ہو جانا

☆☆

O

کام آساں ہو تو دشوار بنا لیتا ہوں
راہ چلتا ہوں تو دیوار بنا لیتا ہوں

جادۂ شوق کو وِیراں نہیں ہونے دیتا
روز نقشِ قدمِ یار بنا لیتا ہوں

یُوں کہ لہجہ سے نمایاں نہ ہو حسرت کوئی
ایک پیرایۂ اظہار بنا لیتا ہوں

وہی تصویر جسے میں نے بنایا سو بار
وہی تصویر پھر اِک بار بنا لیتا ہوں

اے خوشی غم کی کسوٹی پہ پرکھ لوں تجھ کو
اے وفا، آ، تجھے معیار بنا لیتا ہوں

ہائے وہ لوگ جنھیں گِنتا تھا بیگانوں میں
آج ملتے ہیں تو غم خوار بنا لیتا ہوں

شاذ گردشِ گہِ افلاکِ تمنا مت پُوچھ
نَو بہ نَو ثابت و سیّار بنا لیتا ہوں

☆☆

O

نہ جانے کیوں طبیعت ہو گئی اپنوں سے بیگانہ
ترے غم کی بدولت بے نیازی بڑھ گئی اپنی

○

غضب ہے یاد تری یوں خراب حال نہ کر
میں تجھ کو بھولنا چاہوں تو کچھ خیال نہ کر

کدھر چلا ہے دلِ سادہ لوح، سُنتا جا
کہ وہ مزاج نہیں دیکھ عرضِ حال نہ کر

ہزار کھیل ہیں اِک طفلِ آرزو کے لیے
کھلونے ٹوٹ ہی جاتے ہیں یوں ملال نہ کر

اگر ملیں تو یہی شرطِ دید ٹھہرے گی
کہ میں جواب نہ دوں تو کوئی سوال نہ کر

میں آئینہ ترے اُجڑے ہوئے سنگھار کا تھا
تو میرے واسطے آرائشِ جمال نہ کر

بجھے بجھے نہ بجھے آگ کا بھروسہ کیا
غمِ فراق کو پابندِ ماہ و سال نہ کر

خدا کرے کہ تجھے منزلِ مراد ملے
کسی کا نقشِ کفِ پا ہوں پائمال نہ کر

تو اپنے دردِ محبت کی دے مثال مجھے
تو میرے دردِ محبت کو بے مثال نہ کر

کسی کی دید بھی ہے شاذؔ ایک حسرتِ دید
غمِ فراق بہ اندازۂ وصال نہ کر

☆☆

O

مَنظر دُھواں دُھواں ہے طبیعت اُداس ہے
اِک کم سخن نظر دمِ رُخصت اُداس ہے

سَناٹا رو رہا ہے فرشتے کی موت پر
اللہ رے سکوت کہ جنّت اُداس ہے

آجائے رَاس وصل، خُدا ساز بات ہے
کم لوگ جانتے ہیں مسَرّت اُداس ہے

بچھڑے ہوئے ملے ہیں سَرِ راہِ اتفاق
شاداں ہیں حسن و عشق، محبت اُداس ہے

مجھ کوملا ہے شاؔذ، پیامِ نسیمِ صبح
اُس کی قبائے ناز کی نکہت اُداس ہے

☆☆

O

خُدا کے واسطے اِس درجہ بے رُخی نہ بَرت
میں ڈر رہا ہوں جوازِ کرم ملے نہ ملے

O

ایک دُنیا کی سُنا کرتا ہوں، چُپ رہتا ہوں
تُو مَنائے گا تو مَن جاؤں گا سچ کہتا ہوں

اب وہ جھونکے بھی نہیں، اب وہ سفینے بھی نہیں
ایک ٹھہرا ہوا دریا ہوں، کہاں بہتا ہوں

خود فراموش ہوں میں، زود فراموش نہیں
مجھ سے مت کہنا کہ میں ہجر کا غم سہتا ہوں

جس طرف جاؤں ہر اِک سَمت سے آتی ہے صَدا
کوئی رہنے نہیں دیتا ہے جہاں رہتا ہوں

اب یہ عالم ہے کہ صورت ہی نظر آجائے
وہ محبت بھی کرے شاذ یہ کب کہتا ہوں

☆☆

O

وہ کون ہے جس کی وحشت پر سُنتے ہیں کہ جنگل روتا ہے
ویرانے میں اکثر رات گئے اِک شخص ہے پاگل روتا ہے

پھر سَن سے کہیں پُروائی چلی، کھِلتے نہیں دیکھی دل کی کلی
یہ جھوٹ ہے برکھا ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ بادل روتا ہے

ہے اُس کا سَراپا دیدۂ تر، دُنیا کو مگر کیا اس کی خبر،
سب کے لیئے آنکھیں ہنستی ہیں میرے لیئے کاجل روتا ہے

وہ کس کے لیئے سنگھار کرے چندن سا بدن یوں رُوپ بھرے
جب مانگ جھکا جھک ہوتی ہے آئینہ جھلا جھل روتا ہے

بنتی نہیں دِل سے شاذؔ اپنی یہ دوست ہے یا دشمن کوئی
ہم ہیں کہ مُسلسل ہنستے ہیں وہ ہے کہ مُسلسل روتا ہے

☆☆

O

وقت بے رحم ہے لمحوں کو کُچل جائے گا
دِن کو روکو کہ مہینوں میں بدل جائے گا

پھر چلیں ایک گُل اندازِ کم آمیز کے پاس
دِل میں کانٹا ہو کہ ارمان نِکل جائے گا

تُو کہاں جائے کہ آئینہ ترا دُشمن ہے
دلِ دیوانہ سرِراہ بہل جائے گا

اپنے شانوں پہ لیے نکہت برباد تری
ہائے وہ قافلۂ گل کہ جو کل جائے گا

کیا خبر آرزوئے رنجشِ بے جا کیا ہے
کُھل کے مِلنا بھی ترا شاذؔ کو کُھل جائے گا

☆☆

O

کیا خبر تھی کہ ترے بعد یہ دِن آئیں گے
آپ ہی رُوٹھیں گے ہم آپ ہی مَن جائیں گے

زندگی ہے تو بہرحال گذر جائے گی
دِل کو سمجھایا تھا کل، آج بھی سمجھائیں گے

صُبح پھر ہوگی، کوئی حادثہ یاد آئے گا
شام پھر آئے گی، پھر شام سے گھبرائیں گے

اب یہ سوچا ہے ترے کُوچے سے آتے آتے
اپنے سب نقشِ قدم ساتھ اُٹھالائیں گے

کوئی بتلائے کہ تعبیریں کہاں ملتی ہیں
شاؔذ کچھ خواب ہیں، بازار میں دِکھلائیں گے

☆☆

○

سحر و شام مِری دُور کی آہٹ جیسے
بسترِ خواب پہ جاگی ہوئی کروَٹ جیسے

اِک تصنّع ہے کہ سب جیتے ہیں، جی لینا ہے
زندگی تیرے بغیر ایک بناوَٹ جیسے

تُو اسی طرح زِسرتا بقدم میرا ہے
شاطرِ سَرکش و ناکام کی اِک ہٹ جیسے

تیری پلکیں ہیں کہ جس طرح سپر ڈالے کوئی
تیری آنکھیں ہیں تِری پیاس کا پنگھٹ جیسے

اُنگلیاں کانپتی ہیں، چٹکیاں جَل اُٹھتی ہیں
آج تک حُسن کے چہرے پہ ہو گھونگھٹ جیسے

کس کو معلوم تھا ناموسِ جبیں کا انجام
ایک دُنیا ہوئی مجھ کو تِری چوکھٹ جیسے

روشنی چھنتی ہوئی آس کے کاشانے سے
کوئی بھولے سے کھُلا چھوڑ گیا پٹ جیسے

شاؔذ نغموں پہ شبِ وصل کا نُور اُترا ہے
اُس کی پیشانی پہ بالوں کی کوئی لٹ جیسے

☆☆

○

وہ نیاز و ناز کے مرحلے نگہ و سخن سے چلے گئے
ترے رنگ و بو کے وہ قافلے ترے پیرہن سے چلے گئے

کوئی آس ہے نہ ہراس ہے شبِ ماہ کتنی اُداس ہے
وہ جو رنگ رنگ کے عکس تھے وہ کرن کرن سے چلے گئے

کوئی اُن کی آنکھیں سراہتا، کوئی وحشتوں سے نباہتا
کہ وہ آہوانِ رمیدہ خو یہ سُناختن سے چلے گئے

کئی مہر و مہ اُترے آئے تھے وہ یہیں تھے میرے گھر آئے تھے
وہ کلی کلی سے در آئے تھے وہ چمن چمن سے چلے گئے

میرے دل کی آب و ہوا لگی کہ وفا بھی ان کو خطا لگی
وہی سادگی سے جو آئے تھے وہی بانکپن سے چلے گئے

نہ تو کفر کے نہ خدا کے ہم، نہ دوا کے ہم نہ دُعا کے ہم
کہ بُتانِ کعبہ آرزو دلِ برہمن سے چلے گئے

یہ مرا فریب نظر نہیں، مرے ہم قدم تھے یہیں کہیں
مجھے آہٹیں بھی نہ مل سکیں وہ بڑے جتن سے چلے گئے

یہ بجا کہ تحفۂ جاں لیے ترے پاس آئے تھے بے پیے
وہ گدا گرانِ تہی سبو ترے حُسنِ ظن سے چلے گئے

یہی تجھ سے اپنا تھا واسطہ، یہی تھی حیاتِ معاشقہ
تری خلوتوں کے شریک تھے، تری انجمن سے چلے گئے

پسِ عُمر بازوئے شوق پر، سَرِ ناز تھا تو ہوئی خبر
کئی رَت جگے تیرے گیسوؤں کی شِکن شِکن سے چلے گئے

وہ بُجھے بُجھے وہ لُٹے لُٹے، سَرِ راہ شاذؔ ملے تو تھے
اُنھیں اب وطن میں نہ ڈھونڈیئے کہ وہ اب وطن سے چلے گئے

☆☆

O

جو ہونٹ پئے پرسش نہ کھلے، کہتے ہیں کہ اب ہیں صرفِ دُعا
جو آنکھ مری جانب نہ اُٹھی وہ آنکھ سُنا نمناک بھی ہے

O

سُخن، رازِ نشاط و غم کا پَردہ ہو ہی جاتا ہے
غزل کہہ لیں تو جی کا بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے

وہ عالم جب کسی مایوس کا ہوتا نہیں کوئی
تجھے معلوم بھی ہے تُو کسی کا ہو ہی جاتا ہے

کیا ہے میں نے اظہارِ تمنا جانے کس کس سے
مجھے اکثر تری صُورت کا دھوکا ہو ہی جاتا ہے

ہجومِ آرزو ہمراہِ جان و دِل سَہی، لیکن
قریبِ کُوئے جاناں کوئی تنہا ہو ہی جاتا ہے

ہمیں تو عُمر بھر کا غَم کہ ایسا کیوں ہوا ہوگا
ہمیں اب کون سمجھائے کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے

کوئی تُجھ سا نہیں ہے انجمن در انجمن دیکھا
مگر تنہائیوں میں کوئی تجھ سا ہو ہی جاتا ہے

نہ رو یوُں شاذؔ آنکھیں جو دکھائیں دیکھتے جاؤ
نہ اِتنا غم کرو یہ دِل ہے صحرا ہو ہی جاتا ہے

☆☆

بَیاضِ شام

ترتیب

غزلیں

☆☆

انتساب

والدہ مرحومہ کے نام

جوانی لڑکپن کا صدمہ اُٹھائے
مِری راہ میں خارِ غم بو چکی ہے
دُعاؤں کے ہالے میں محفوظ تھا میں
مِری رات وہ چاندنی کھو چکی ہے
بھلا شورِ دنیا میں کس طرح ڈھونڈوں
وہ لوری خَلاؤں میں جو کھو چکی ہے
مجھے خاک سے نسبتِ سَر ہے اب تک
مِری آنکھ مٹی پہ خوُں رو چکی ہے
ترے زیرِ پا میری جنّت تھی پنہاں
کئی سال گزرے جو گُم ہو چکی ہے

☆☆

مناجات

اِک حرفِ تمنا ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مِرے مولا

اے دِل کے مکیں دیکھ یہ دل ٹُوٹ نہ جائے
کاسہ مِرے ہاتھوں سے کہیں چھوٹ نہ جائے
میں آس کا بندہ ہُوں بڑی دیر سے چُپ ہُوں
کب تک مِرے مولا

یہ اشک کہاں جائیں گے دامن مجھے دے دے
اے بادِ بہاری مِرا گلشن مجھے دے دے
میں شاخ سے ٹُوٹا ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مِرے مولا

سَرتا بقدم اپنی مُرادوں کو سنبھالے
جاتے ہوئے تکتے ہیں مجھے قافلہ والے
میں لالۂ صحرا ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مِرے مولا

اے دستِ طلب کیوں تری باری نہیں آئی
کہنا، مِرے آقا کی سواری نہیں آئی
تصویرو تماشہ ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مِرے مولا

ممکن نہیں یہ آنکھ تری دید کو ترسے
ہر رنگ میں دیکھوں تجھے دیوار سے دَر سے
میں تو ترا رستہ ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا

اے کاشفِ اسرارِ نہانی ترے صدقے
اب شاذ کو دے حکمِ روانی ترے صدقے
ٹھہرا ہوا دریا ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا

شجرِ ممنوعہ

صبح و مسا رہینِ ستم ہائے بے شمار
تارِ نفس کی خیر ہو، عمرِ رواں کی خیر
سورج کا خوف، چاند کا ڈر، چاندنی سے شرم
گلشن سے پردہ، گُل سے ندامت، کلی سے شرم
لیکن بایں ہمہ، مرے ذوقِ جواں کی خیر

یوں ٹوٹ کر حیات سے کرتا رہا ہوں پیار
جس طرح بیاہتا سے محبت کرے کوئی!

☆☆

بازدید

حِنائی ہاتھ بصد ناز و احتیاط و حجاب
پئے سلام جبیں تک بڑی اَدا سے گیا

o

کچھ اور سُرخ ہوئے ناخنوں کے شوخ ہلال !
انگوٹھیوں کی جھکاجھک میں انگلیوں کی پھَبن
کہ جیسے نُور سا مرمر کی جالیوں سے چھنے
سجل بدن کی گلابی مئے حیَا سے گدَاز
جھجک میں، جھینپ میں، اِک سعیِ خودنگہداری
ہر ایک زاویۂ جسم ہے عبَادت گاہ
تراشِ تنگ قبامعصیت پناہ بھی ہے
تری نگاہ سلامت، ترے شباب کی خیر
کنوارے پَن میں بھی چھب تھی سَدا سہاگن کی
دُلہن بنی ہے تو لَوٹ آیا ہے کنوارا پَن،

☆☆

قمرنامہ

ملاقات کی یہ شب اوّلیں،
ہوا کیف ساماں، فضا احمریں
یہ ہنگامِ جلوہ یہ گُل بانگِ دید
یہ میلادِ آدم یہ نوروزِ عید

○

قمر اپنے شاعر کی رُوداد سُن
پلک سے مری، اشکِ دیدار چُن

○

مُغنّی ہوں کرتا ہوں سُر کا سنگھار
شعاعوں سے گوندھا ہے گیتوں کا ہار
یہ تشبیہہ کا رَس تری دین ہے
یہ الفاظ کا جَس تری دین ہے
شناسائی تجھ سے ترے نُور سے
رہی ہے مجھے دیر سے، دُور سے
مجھے یاد ہے اپنے بچپن کا سن
شرارت کی راتیں، شرارت کے دِن
تعارف ہَوا غائبانہ ترا
سُنا اپنی ماں سے فسانہ ترا
وہ وادیٔ رنگین و جادُو صفات

وہ بُڑھیا کا قِصّہ وہ چرخے کی بات
پُکارا تجھے سو دفعہ پیار سے
یہی آس اُترے تو دیوار سے
وہ معصوم سی اِک محبت مری
وہ ننھی سی مِنّت سماجت مری

O

غرض تو سنِ وقت بڑھتا گیا
زمانے کا سیلاب چڑھتا گیا

O

کہوں کیسے اُفتادِ عہدِ شباب
جُدائی کی تعبیر چاہت کا خواب
وفا کا چلن نیشتر کی طرح
بیاباں کی وُسعت بھی گھر کی طرح
مری بستیاں جب خرابہ بنیں
یہ آنکھیں لہُو کا دو آبہ بنیں
کسی کی ملاقات و رخصت کا غم
مری عُمر بھر کی مسرّت کا غم
بہ ایں سِلسلہ ہائے شام و سحر
مرے واسطے تُو رہا چارہ گر
بجز تیرے ہمدرد کوئی نہ تھا
رفیقِ رُخِ زرد کوئی نہ تھا

O

اسی رشتۂ دَرد نے کھینچ کر
مجھے لابٹھایا ترے بام پر

O

مِرا ذوق و شوق و تگ و تاز دیکھ
جنوں ہو چلا ہے خرد ساز دیکھ
مسلسل خروشاں، رَواں، نغمہ خواں
اَزل کے مُسافر کی منزل کہاں
گِل و خاک کی سَرفرازی کی خیر
کمندِ ہُنر کی دَرازی کی خیر
زمامِ عناصر سنبھالے ہوئے
ستاروں کی گیندیں اُچھالے ہوئے
نہفتہ دریچوں کو کھولے ہوئے
خلاؤں کی نبضیں ٹٹولے ہوئے

پُجاری ترا، تیری چوکھٹ پہ ہے
جنم کا یہ پیاسا چندرتٹ پہ ہے

☆☆

آتشکدہ

سب نامۂ گُل سب حرفِ وفا
سب خوشبوئیں، سب رنگِ حِنا
ہر مصرِ طرب کے کاشانے
نجدِ دل و جاں کے سنّاٹے
یونانِ نظر کے بُت خانے
سب آتشداں کی نذر ہوئے
شعلوں کی زبانیں چیخ پڑیں
چنگاریاں کانپیں، تھرّائیں
مَیں جن کو بھول کے شاداں تھا
وہ ساری باتیں یاد آئیں

○

کیا کیا نہ جلا، کیا کیا نہ بُجھا
سرگوشی کی ہر بات جلی
القاب کے نازک پردوں میں
کن لفظوں کی سوغات جلی
برکھا کے سویرے کجلائے
جاڑوں کی سُہانی رات جلی
اِک مان سرور سُوکھ گیا
امرت کی بھری برسات جلی

اِک چاند کی کرنیں ٹوٹ گئیں
اِک سورج کی بارات جلی

O

چُپ چاپ جلے، اس آگ میں ہم
تن خاک ہوا، دامن نہ جلا
سب پیار کے پودے کُمھلائے
مٹّی نہ جلی، آنگن نہ جلا
تم خوش ہو اپنی گرہستی میں
(گو ہاتھ جلے، کنگن نہ جلا)
میں اپنے گھر آسودہ ہوں
(چہرہ ہی بُجھا، درپن نہ جلا)

☆☆

سائنس

سبز گنجان گھنی جھاڑیوں کی چھاؤں میں
پو پھٹے کُہر کی مہکار میں ساگر تٹ پر
جانے کیا کوکتی ہے کوئی اکیلی کوئل
جانے کیا سوچ رہا ہے یہ رسیلا منظر!

ایک سنّاٹا ہے معمورۂ احساس و جمال
خوف آتا ہے کہ آواز نہ بن جائے کہیں،!

سروساماں

پتھر کے بازارِ سیہ میں
شیشے کا سوداگر ہوں مَیں

○

میرا اثاثہ، میری دولت
آنکھوں کا نمناک تبسّم
ماتھے کی کاواک لکیریں
سانسوں کی تھّی سی دُعائیں
ذہن کی جوُدت دل کی شرافت
جینے کی اپنی سی لگن میں
زہر بھی امرت غم بھی مسرّت
یوُں رکھتا ہوں اپنے ہُنر کو
جیسے گانے والا گداگر
نانِ شبینہ کی حسرت میں
سو پردوں میں زخم چھپا کر
اپنا ساز جَتن سے رکھے

☆☆

فسونِ نیاز

یہ دشتِ بے سر و ساماں، یہ سوزِ نیم شبی
جہاں بھی چشمۂ ریگِ رواں نظر آیا
چمک اُٹھا ہے مرا داغِ تشنہ لبی

O

گریزپا ہے کہ ہے پا بہ گِل یہ عمرِ وفا
حیات ہے کہ سن و سال کی دُہائی ہے
مَیں وہ کہ جس کو بیاباں سے مُشتِ خاک مِلی
مرا طریقِ طلب ہے کہ جگ ہنسائی ہے
گُلِ شگفتہ نہ مانگوں، گُلِ چکیدہ سہی
رسائی ہے کہ یہ احساسِ نارسائی ہے

O

ہزار شکر مرے پاس کوئی برگ نہ ساز
پُکارتا ہے نسب نامۂ جبیں کیا کیا
"حریفِ مطلبِ مُشکل نہیں فسونِ نیاز"

☆☆

گونج

یاد کے گنبدِ بے دَر کی اسیری کیا ہے
کوئی آہٹ، کوئی سسکی، کوئی فریاد تو ہو
آپ اپنے کو پکاروں کہ ذرا جی بہلے
یہ خرابہ کسی عنوان سے آباد تو ہو

O

لیکن اِک خوف کہ گونجی ہوئی آواز کہیں
اپنی ہی رُوح کے سناٹے کا کُہرام نہ ہو
ایک کھوئے ہوئے لہجے میں ترا نام نہ ہو

☆☆

مَیں اور تُو

کون ہے تُو، پگلی لگتی ہے
کچّی کونپل، اکہری ڈالی
برکھا رُت کی پہلی بَدلی
دن چُھوئی مَدرا کی پیالی
کوری گاگر، مہکی کیاری
بولتا گھُنگھرو، بجتی تالی
مَدماتی، شرمیلی، گُم سُم
پھول کے مُنہ پر اوس کی جالی
چندر کرن کا سایہ سر پر
پگ پگ چُومے بَن ہَریالی
اشرفیوں کی مُورت پھر بھی
رُوح پیاسی آنکھ سوالی
مندر کی محراب میں جیسے
منّت کی سونے کی تھالی
تن مَن میں تہوار کی دُھومیں
چہرہ ہولی مانگ دِوالی

o

مَیں تو جلتی ریت کا چشمہ
میرے تٹ پر جگ پیاسا ہے
اَبر ہوں لیکن چاند کے رُخ پر
میری چھاؤں میں اندھیارا ہے
پیڑ گھنا ہوں، لیکن مَیں نے
چلتا رستہ روک رکھا ہے
جھڑتے پھول کی سِسکی ہوں مَیں
مجھ سے شاخ کا زخم ہَرا ہے
لُٹتے کھیت کا سونا ہُوں مَیں
میرا اپنا مول ہی کیا ہے
ٹکڑے ٹکڑے بکھرا دل کا
ساگر ساگر ڈول رہا ہے
جیون کی کھائی میں ناداں
میرے گہرا زخم لگا ہے
تُو سِیتا ہے میرے حق میں
دیکھ مجھے بَن باس مِلا ہے

☆☆

فِطرت

وہ چڑھتی بیل ہے، نازک، لجیلی، بَل کھاتی
چٹک رہی ہیں رگیں، کسمسا ہٹوں کی یہ رُت
سجل، دہکتی، مہکتی، رسیلی، مدماتی
وہ لوک لاج کی ماری ہے، کون سمجھائے

O

یہ ضِد بھی شرم ہے، فطرت سے اجتناب نہ کر
لپٹ بھی جا کسی دیوار سے حجاب نہ کر

☆☆

جَذب وگُریز

رُو برو ہو کے بھی نظریں نہ ملائیں اُس نے
اپنی روئی ہوئی آنکھوں کو چھپانا چاہا
ہائے وہ کیفیتِ عجز بہ ہنگامِ سلام
اُس سَرافراز نے جب سر کو جھکانا چاہا
سِیپ سی اُنگلیاں تھرّائیں، جبیں سرد ہوئی
جیسے سَر تا بقدم مجھ میں سَمانا چاہا
زیرِ دامانِ حیا شمع جَلانی چاہی
بِناز فرماتے ہوئے ناز اُٹھانا چاہا
سُخنِ لُطف کو سَرگوشی کا درجہ دے کر
تابہ امکاں مجھے نزدیک بُلانا چاہا

O

لیلئ نجد، دکن، جانِ وطن، رُوحِ سخن،
غم کو محمل نہ سمجھ، عشق کو پردا نہ بنا
مہر کو چُور نہ کر، ماہ کو بے نُور نہ کر
نیند کو زخم نہ دے، خواب کو دھڑکا نہ بنا
لحن کو سوز نہ دے، ساز پہ مضراب نہ رکھ
سانس کو آہ نہ کر، فکر کو نغمہ نہ بنا
رُوپ کو دُھوپ نہ دے، رنگ کو شعلہ نہ دِکھا
دَر کو دیوار نہ کر، سَنگ کو شیشہ نہ بنا
تُو کہ خلوت میں رہے انجمن آرا بَن کر
مجھ کو بازار ہی رہنے دے تماشہ نہ بنا

☆☆

اب کے برس

کوئی دستک کوئی آواز کوئی نغمۂ نو
درِ گُل باز کرے اے بادِ صبا اب کے برس

چاند کو گھول دے پیمانۂ شب میں اب کے
رنگ میں ڈوب دے سورج کی ضیا اب کے برس

شمع کا نُور ہو پگھلے ہوئے کُندن کی طرح
خاکِ پروانہ کو اکسیر بنا اب کے برس

ہر مہینہ پہ ہو پھولوں کے مہینہ کا گُماں
ہر دن آتی رہے ساون کی گھٹا اب کے برس

سرو و شمشاد و صنوبر کو ملے لُطفِ خرام
شبنمِ خفتہ کو دے اذنِ بقا اب کے برس

جانبِ دل سے چلے ذکرِ رہ و رسمِ جنوں
سمتِ خُوباں سے بندھے عہدِ وفا اب کے برس

نیم رس رہنے نہ پائے مِری صہبا ساقی
تلخیِ کام و دہن اور سِوا اب کے برس

مَن کے گوکُل میں کوئی ناز کا گھنگھرو بولے
تن کے مدھوبن میں کوئی لُو کا لگا اب کے برس

کھول دے بابِ اثر رول دے کچھ لعل وگُہر
ابر کی طرح اُٹھے دستِ دُعا اب کے برس

☆☆

مہر و مہتاب کی دُخترِ اوّلیں

مہر و مہتاب کی دُخترِ اوّلیں
دُودمانِ چَراغاں کی نُورِ نظر

O

یہ سَراپا یہ فوّارۂ ہفت رنگ
یہ بدن شاخِ ممنوعِ ارضِ بشر
یہ مدوّزخم جسم، یہ زاویے
جیسے تقدیس و عصیاں ہوں دامن نگر
لب، شفق زار کے احمریں حاشیے
آنکھیں، سانجھ اورسویرے کے نیلے بھنور

O

مہر و مہتاب کی دُخترِ اوّلیں
دُودمانِ چَراغاں کی نُورِ نظر
مَیں کہ فن کار ہوں، آئینہ ساز ہوں
تیرے گیسو کی نسبت سے نافہ بہ جاں
تیری قامت کا صَدقہ سَرافراز ہوں
تیرے ابرو کے معبد کا ہوں معتکف
مُصحفِ شوق کا حرفِ آغاز ہوں

دھیان ہوں تیری گُل کار تنہائی کا
سوچ کی گونج ہوں، تیری آواز ہوں
تیرے پیکر کے کُندن کی ہوں روشنی
تیرے ہونٹوں کے یاقوت کا راز ہوں

O

مہر و مہتاب کی دُخترِ اوّلیں
دُودمانِ چَراغاں کی نُورِ نظر

O

یہ جھجک یہ لگاوٹ، یہ بارِ حیا
مُو بہ مو آرزُو مندِ اظہار ہے
بہرِ دستِ رسا انتظارِ حیا
یہ مہکتا شلوکا چھلکتا بدن،
یہ چٹکتی رگیں یہ مسکتا بدن،
مہر و مہتاب کی دُخترِ اوّلیں
دُودمانِ چَراغاں کی نُورِ نظر

O

تجھ کو معلوم ہے عشق کیا چیز ہے
جیسے دریا کی تاریک شب میں کوئی
سطحِ گرداب پر شمع روشن کرے
یا کوئی نار مندر کا پٹ کھول کر
یوُں چلے یوُں قدم دھیرے دھیرے دھرے

کوئی گھنگھرو نہ بولے نہ گھونگھٹ کھلے
اپنی جھانجھن کی جھن جھن سے پگ پگ ڈرے

O

تجھ کو معلوم ہے عشق کیا چیز ہے
پو پھٹے جیسے جگنو کی لَو کانپ اُٹھے
شاخ سے ٹوٹ کر جیسے کوئی کلی
دستِ گلچیں کو حسرت سے تکتی رہے
جیسے میداں میں زخمی سپاہی کا غم
چھوڑ کر جس کو تنہا کُمک چل پڑے
تجھ کو معلوم ہے عشق کیا چیز ہے
جیسے صحرا کو گھر میں بُلالے کوئی!
چیختے شہر کے ہونکتے شور میں
زہر خاموشیوں کا مِلا لے کوئی
نار کو آنسوؤں سے بُجھاتے ہوئے
نُور میں جیسے آنکھیں گنوالے کوئی
آپ اپنی رقابت کا سودا لیئے
زندگانی کے لمحے چُرالے کوئی
اپنی سانسوں میں نشتر چھپائے ہوئے
عُمر دانستہ جیسے گھٹالے کوئی

O

مہر و مہتاب کی دخترِ اوّلیں
دُودمانِ چراغاں کی نورِ نظر

○

کون ماضی کے افسانے دُہرائے گا

کون بچھڑے گا، پھر کون یاد آئے گا

نجد کی گرد میں قیس کیوں کھو گیا

کوہکن سو گیا بے سُتوں کھو گیا

کس کو فرصت کہ غم کا اعادہ کرے

اپنا اپنا نشاں چل ذرا ڈھونڈھ لیں؛

جوئے شِیر آج بھی گُنگُناتی ہوئی

بہہ رہی ہے کہاں؛ چل ذرا ڈھونڈھ لیں

☆☆

ایک سال بیت گیا

مرے رفیق، مرے محترم، مرے شاہد ؎
تجھے بھلائے ہوئے ایک سال بیت گیا
تو محوِ خواب ہے، تیرا کوئی قصور نہیں
ہمیں جگائے ہوئے ایک سال بیت گیا
زمانہ فرصتِ نظّارگی نہیں دیتا
تجھے چھپائے ہوئے ایک سال بیت گیا
تعلقات جنھیں استوار سمجھے تھے
وہ سب پرائے ہوئے ایک سال بیت گیا
چڑھائیں چادرِ گُل، یا رِدائے اشک کہ آج
تمیز اُٹھائے ہوئے ایک سال بیت گیا
دِلوں میں تُو، ترا مدفن زمیں پہ تودۂ خاک
یہ راز پائے ہوئے ایک سال بیت گیا
کہاں ہے صُورِ سَرافیلِ نالہ و فریاد
کہ حشر اُٹھائے ہوئے ایک سال بیت گیا
چلو چَراغ جلائیں سَرِ مزارِ حبیب
کہ لَو بڑھائے ہوئے ایک سال بیت گیا

☆☆

؎ شاہد صدیقی مرحوم کی پہلی برسی پر

سَر بَستہ

رُت پھری بھورپون جھوم کے اِٹھلا کے چلی
کیا ہُوا اب کے کسی نے مجھے پاگل نہ کہا
مَیں نے دیکھا نہیں، کس طرح کِھلی بند کلی

O

بھری برسات بھلی آئی، بھلی بیت گئی
سَن سے جھونکے نہ چلے، چھن سے نہ شبنم ٹپکی
رنگ کی گرد سرِ صحنِ شفق بیٹھ گئی
پیشِ ساقی نہ مری اُوک سے صہبا چھلکی
بند کمرے کے دریچوں کے سُنہرے شیشے
سانولی بدلی کے ٹکرانے سے زخمی نہ ہوئے
تھی شبِ ماہ سے اشکوں کی شناسائی بہت
اب کے اپنے دلِ گُم گشتہ کی یاد آئی بہت
مَیں کہ ہوں قافِ طلسمات کے نغموں کا سفیر
کوئی بتلائے کہ کس شہر میں آپہنچا ہوں
جوہرِ عرضِ ہُنر، سیم نہیں، زَر نہ سہی
دست و بازوئے معیشت کا یہ زیور نہ سہی
بُوئے گُل نکہتِ گندم کے برابر نہ سہی
مجھ میں سویا ہوا دیوانہ یہ چلّاتا ہے
دِن کی توقیر بجا، رات سے انکار نہ کر

خلوتِ دل کی ملاقات سے انکار نہ کر
سوچ میں گُم ہوں یہ رہ رہ کے خیال آتا ہے
کہ میں اِک عالمِ سَربستہ ہوں سَیّارہ ہوں
وہی شب گرد ہوں، سودائی ہوں، آوارہ ہوں
شورشِ دَہر مجھے بھیک دے تنہائی کی
کہ یہ احساس نہ مَر جائے کہ میں زندہ ہوں

☆☆

جھوٹ سچ

ذرا سی آرزوئے وصل باقی ہے بہت سمجھو
کہ سانسوں کو غنیمت، زندگی کو مصلحت سمجھو
تمہیں بھولا ہوا ہوں اور زندہ ہوں یہ مت سمجھو
یہاں یہ حال ہے بس خیریت ہی خیریت سمجھو

O

نہ چاہو بھی تو یہ دُنیا ہے، خوش رہنا ہی پڑتا ہے
شریکِ زندگی سے جھوٹ سچ کہنا ہی پڑتا ہے

☆☆

حرفِ مکرّر

شام پر شام اَبد کا ہے گُماں دیکھو تو
کوئی ہے، کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں
(کیا ابھی گھُومتی ہے مہر کے اطراف زمیں)

O

نُور آنکھوں کا مقدّر ہے سُنا تھا میں نے
لَب کو اظہار کی معراج سمجھ بیٹھا تھا
ایک دھڑکن تھی کہ جس پر تھا مجھے دل کا فریب،
سَر کو خاکم بہ دَہن تاج سمجھ بیٹھا تھا

O

کون پڑھ پائے مجھے، کس کا گذر ہوگا اِدھر،
شبنم و آب سے لکھا ہُوا اِک کتبہ ہُوں،
اپنی ہی قبر کا جارُوب کشِ تنہا ہُوں،

☆☆

حصارِ سنگ

صلیب آراستہ، مقتل چراغاں ہے، جہاں میں ہوں
اِدھر تم ہو، اُدھر دُنیا کھڑی ہے، درمیاں میں ہوں

O

شکایت کیا کروں، مجھ پر اگر پتھر برستے ہیں،
میں اپنے آپ کو شاخِ ثمر ور کہہ کے ہنستا ہوں
سَراپا تم ہو میری، جان و دل سے میں تمہارا ہوں،
جو دُوری ہے تو دُوری کو مقدّر کہہ کے ہنستا ہوں

O

تمہیں اندیشۂ رُسوائی و خوفِ جہاں ہوگا
مگر مجھ سے بہت دِن تک خود آزاری نہیں ہوگی
تم اِک دیوار ہو، میں زیرِ سَایہ ہوں، بجا لیکن
مجھے سَر مار کر مَرنے میں دُشواری نہیں ہوگی!

☆☆

ثالث

میں اور دُنیا سوچ رہے تھے
ہم دونوں میں کون بڑا ہے
ہنسی ہنسی میں ٹھن جاتی تھی
تم جو بیچ بچاؤ نہ کرتے
جانوں پر بھی بَن جاتی تھی
کیسا جھگڑا ہو جاتا تھا

☆☆

بانس کا جنگل

دُور تک بانس کا جنگل ہے، گھنا، تیرہ و تار
جب سنکتی ہے ہوا سیٹیاں لہراتی ہیں
ڈُوبتی جاتی ہے پھر گُونج کی مدّھم جھنکار
پھر وہی ہُو کا سماں پھر وہی حیرت کا دیار
بَن کے سناٹے میں اِک شعلہ ہے تنہا تنہا
کوئی فانوس کی دیوار نہ شیشے کا حصار
کچھ نہیں کچھ بھی نہیں، وسوسۂ جاں کے سوا
خس و آتش کی یہ ہمسائگی یہ ربط وگریز
راکھ کا چار طرف ڈھیر نہ ہو جائے کہیں،
تم چلے آؤ یہاں دیر نہ ہو جائے کہیں،

پرسش

میں نے رو رو کے خدا سے یہ دُعا مانگی تھی،
مجھ پہ وہ دن نہ قیامت کی طرح ٹُوٹ پڑے
جب تجھے دیکھ کے دل عذرِ پشیماں بن جائے
پاس کچھ بھی نہ رہے بے سروساماں بن جائے
کھُل کے رو بھی نہ سکوں، اشک چھپا بھی نہ سکوں
بات کرنی تو کُجا، بات بنا بھی نہ سکوں

○

جس سے رنجش بھی ہو، جھگڑا بھی ہو، یارانہ بھی
جو مری شمع بھی ہو، جو مرا پروانہ بھی
اُس سے ملتے ہوئے یہ شرط ہو منظور مجھے
کہ زباں کھولوں تو آدابِ سخن یاد رکھوں
درد لہجے میں نہ ہو، آنکھ میں حسرت نہ رہے
کہ مَیں ہُوں شاعرِ رُسوائے وطن یاد رکھوں
دیکھ کر اپنے مسیحا کو جھکالوں نظریں
اپنی جلتی ہوئی سانسوں کی دُکھن یاد رکھوں
اپنی زنجیر کی وُسعت کو کہیں بھول نہ جاؤں،
اپنی تقدیر کے ماتھے کی شِکن یاد رکھوں

○

آج اِک بزم میں دیکھا تجھے فردا کی طرح
اور میں ماضیِ گم گشتہ کی مانند خراب
مطمئن تھا کوئی پہچاننے والا ہی نہیں
کہ وہ افسانۂ دل ہے نہ وہ چہرے کی کتاب
تُو نے رسماً ہی سہی پُوچھ لیا میرا مزاج
جس طرح قبر کے سینے پہ رکھے کوئی گلاب

شکستِ اَنا

یہ جبیں، مطلعِ خورشیدِ جہانِ بیدار
شش جہت کے یہ سُتوں بازوئے سنگلاخ وجواں
میری اُمیدگہِ نُور یہ آنکھیں، یہ دماغ
آج چُپ چاپ ہوئے گرم لہو میں غلطاں،
کس سے فریاد کروں دردِ مجسّم ہُوں مَیں
تُو نے جانا بھی کہاں وقت ہُوں رستم ہُوں مَیں
اب بھلا کیسے جگاؤں کہ گراں خواب ہے تُو
مجھ کو معلوم نہ تھا شاذؔ کہ سہراب ہے تُو

تمہارا واسطہ کیا ہے

مرے مزاج کا یہ عجز و انکسار یہ درد
وفورِ کیف میں گم گم اُداسیاں میری
کشادہ دست و تہی جیب سیر چشم و گدا
عطائے خاص ہیں واماندہ حالیاں میری

یہ در گذر کی صفت یہ فروتنی کی ادا
ہر اِک سے رسم و رہِ دِلدہی نبھائے ہوئے
برہنہ پا ہوں کہ کانٹوں کا پاسِ خاطر ہے
خمیدہ پشت ہوں بارِ جہاں اُٹھائے ہوئے

تمہارا واسطہ کیا ہے کہ پا بہٗ گل ہوں میں
وگرنہ کھیل ہی سارا بگڑ چکا ہوتا
گرا ہی دیتا یہ دیوارِ آب و رنگ اب تک
میں اِس جہاں سے بہت پہلے لَو چکا ہوتا

☆☆

بارِ وفا

پھر وہی آنکھیں، وہی میری طرفدار آنکھیں،
مُسکراتی ہوئی دِلدار، مِلنسار آنکھیں،
نارسیدہ یہ تمنائیں، یہ اَرمان ترے
صاف آمادۂ شب خُوں یہ پلک بان ترے
یہ کھلی زُلفیں یہ شب زادیاں نکہت بردوش،
اُف یہ دوشیزگئی بَر یہ کنواری آغوش،
راہِ عصیاں سے اُبلتی ہوئی یہ جُوئے ثواب
معبد جسم، یہ کُندن کے کلَس یہ محراب
سرِ افگندہ نگاہوں میں مُناجات لیئے
ہَمہ تن آرزُوئے دید و ملاقات لیئے
تُو کہ ہے مُنتظرِ جرأتِ اظہارِ وفا
پھر وہی بارِ وفا، پھر وہی تکرارِ وفا
درد سرشار ہوں، لذّت کشِ آزار ہوں میں
صورتِ نقش ہوں میں، صورتِ دیوار ہوں میں
کیا کہوں تجھ سے مِری سانس رُکی جاتی ہے
تیرے پہلوُ میں کسی اور کی یاد آتی ہے

☆☆

خواب زار

چاند جگمگاتا ہے
تھال جیسے کُندن کا
ہر کرن کے سینے میں
پھوٹتی ہیں جھنکاریں
یہ پھوار سی خنکی،
یہ کٹار سی دھاریں
رات سے گُریزاں تھا
رات پھر چلی آئی
بھولی بسری باتیں کیوں
کہہ رہی ہے تنہائی

O

تُو اگر یہاں ہوتی
رنگ ہی دِگر ہوتا
سب گِلے تجھی سے تھے
کس سے کیا گلہ کیجئے
مانگنا تجھی کو تھا
کیوں کوئی دُعا کیجئے
تُو اگر یہاں ہوتی
رنگ ہی دگر ہوتا

O

رنج و شادمانی کا
میری زندگانی کا
روز و شب کی رنگت کا
عیش کا اذیّت کا
طَور ایک دُنیا کا
غیر کا شناسا کا
دوستوں کی باتوں کا
دُشمنوں کی گھاتوں کا
قہقہوں کی گونجوں کا
جشنِ مئے کی دُھوموں کا
صبح و شام ہونے کا
میٹھی نیند سونے کا
ڈالیوں کے جُھکنے کا
برگِ گُل پہ شبنم کے
قطرہ قطرہ رُکنے کا
رقص رات بھر ہوتا
رنگ ہی دِگر ہوتا
تُو اگر یہاں ہوتی

O

طائروں کے اُڑنے کا
ٹھنڈی ٹھنڈی جھیلوں کے
کونے کونے مُڑنے کا
راستہ جدھر ہوتا
رنگ ہی دِگر ہوتا
تُو اگر یہاں ہوتی

○

شام مہکی مہکی سی
اگر ئی، ملا گیری
چاند کا شہابی پَن
چاندنی کا چندن بَن
کیفِ خود فراموشی،
نیم شب کی خاموشی،
کتنی مہرباں ہوتی
تُو اگر یہاں ہوتی
رنگ ہی دِگر ہوتا

○

طبع کی رَوانی میں
اِس بھری جوانی میں
کتنے کام ادھورے ہیں
کوئی کام کرلیتا
آئینے مقابل تھے
میں بھی کچھ سنور لیتا

پتھروں کے سینے میں
مُورتیں مچلتی ہیں،
آئنوں میں نا دیدہ
صُورتیں مچلتی ہیں،
ہر سفالِ نم خوردہ
کُوزہ گر کی دُھن میں ہے
آب و گِل کا شیرازہ
بال و پَر کی دُھن میں ہے
برگِ گُل کے صفحوں پر
ہیں نمو کی تحریریں
انتظارِ فردا میں
مہر و مہ کی تقدیریں،
کاروانِ روز و شب
یُوں نہ بے خبر ہوتا
میں بھی ساتھ ہولیتا
یُوں نہ دَر بَدر ہوتا
قدرِ زندگی ہوتی
موت کا بھی ڈر ہوتا
ہائے اِک رفاقت کا
جشن عُمر بھر ہوتا
تُو اگر یہاں ہوتی
رنگ ہی دِگر ہوتا

ہمزاد

وہ اِک شخص جس کی شباہت سے مجھ کو
بہت خوار و شرمندہ ہونا پڑا تھا
قبائے رُوح کی مَلگجی ہوگئی تھی
کئی بار دامن کو دھونا پڑا تھا

وہ مجھ جیسی آنکھیں، جبیں، ہونٹ، ابرُو
کہ باقی نہ تھا کچھ بھی فرقِ مَن و تُو
وہی چال، آواز، قد، رنگ مدّھم
وہی طرزِ گفتار، ٹھہراؤ کم کم

خدا جانے کیا کیا مشاغل تھے اس کے
مِرے پاس لوگ آئے، آ آ کے لَوٹے
کئی مجھ سے اُلجھے، کئی مجھ سے جھگڑے

میں روتا رہا بے گناہی کا رونا
مِرے جُرم پر لوگ تھے قہقہہ زَن
نہ کام آیا اپنی تباہی کا رونا

وہ ظلمت میں چھپ چھپ کے دن کاٹتا تھا
میں دن کے اُجالے میں مارا گیا تھا

سُنا رات وہ مرگیا کیا غضب ہے
اُسے دفن کر آئے لوگوں کو دیکھو!
مَیں کمبخت نظروں سے اوجھل ہی کب تھا
یہ کیا کر دیا، ہائے لوگوں کو دیکھو!

☆☆

اَن کہی

لفظ کچھ تیرا بَدن تو نہیں اے سَروِ رَواں
میں جسے چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں، گھبراتا ہوں
رنج رہتا ہے کہ صورت نہیں پکڑے گا خیال
سحر و شام، یہی سوچ کے رہ جاتا ہوں
کہ معانی کے مقدّر میں ہے بے بال و پَری
ایک تسکین کے پیچ و خمِ اسرارِ نہاں
عکس اُتاریں گے فقط ذہن کی دیواروں پر
خوفِ رُسوائی نہ اندیشۂ اظہارِ بیاں
نہ کوئی شور، نہ آواز، نہ نغمہ نہ فُغاں،

☆☆

طیورِ آوارہ

گھر کا آنگن
فرشِ سبزہ
اوس کے کُہرے کا نَم
سوچ کی رَو بہہ رہی ہے پیچ و خم کھاتی ہوئی
اپنے ہونے کا گُماں اپنے نہ ہونے کا یقیں
بس گیا ہے رُوح میں برسوں کی تنہائی کا غم
مَد بھرے کومل سُروں میں لوریاں گاتی ہوئی
چاندنی کو اپنے زانو پر سُلاتی ہے زمیں،
نیم شب
گہری خموشی،
کسمساتی آہٹیں،
چاند، موُبافِ طلائی زلفِ شب کے واسطے
بام و دَر ہیں بارِ خشت و سنگ سے سہمے ہوئے
کچھ سُنی، کچھ اَن سُنی سی گنگناتی آہٹیں
تازیانہ میرے دردِ بے سبب کے واسطے
چار سُو دُھندلے ہوئے کُہرے کی مدّھم روشنی
چاندنی، پگڈنڈیاں، اشجار، کم کم روشنی
O

ریل کی سیٹی

خدا جانے کہاں جاتے ہیں لوگ

کیا یہ سچ ہے پھر پلٹ کر اپنے گھر آتے ہیں لوگ

O

دُور تک شہرِ خموشاں دُھند میں لپٹا ہوا

دُور تک کتبے ہیں شب بیدار آبادی لیے

خاک پر اُبھرے ہوئے نقشِ جمیلِ آخری

زندگانی کے سفر کے سنگِ میلِ آخری

دُور تک برفاب جسموں کے کھنڈر پھیلے ہوئے

جانے کیسے لوگ تھے کیا خال و خط گُم ہو گئے

شورِ دُنیا کیا قیامت ہے یہ کیسے سو گئے

جانے کتنے دن ہوئے اِن کے کفن میلے ہوئے

کیا نہیں ممکن کہ زندہ آدمی کی قبر ہو

ننھی ننھی کتنی قبروں کے ہیں وارث سینکڑوں

چاند مر جاتا ہے، سورج لوٹ کر آتا نہیں

اِس طرح تاریکیوں میں روشنی کی قبر ہو

سچ کی گردن جھوٹ کے زیور سے ہے خم آشنا

کج رَوی کے زیرِ سایہ نازکی کی قبر ہو

آرزوؤں کے فنا کی یادگاریں کیوں نہ ہوں

جیتے جی ہر موت پر اک قبرِ تازہ چاہیے

روز و شب کرتے ہیں ہم گِن گِن کے عُمروں کا حساب

مشغلہ ٹھہرا تو زخموں کی قطاریں کیوں نہ ہوں

O

چاندنی نسیاں کے بام و دَر پہ ہے چھائی ہوئی

پڑ گئے ہیں بھولی بسری کتنی یادوں کے شگاف
کن خیالوں کی ابابیلوں کے مسکن، بن گئے
پھڑ پھڑا کر چیختی رہتی ہیں آدھی رات کو
بازوئے سقف وسُتوں زخمی ہیں کتنے سال سے
عنکبوتِ یادِ پارینہ کے جالے تن گئے
وقت کی آنکھیں فصیلوں پر ہیں پتھرائی ہوئی
اِس زمیں میں دھنس گئے ہیں، کیسے کیسے کوہِ قاف
اُس کی آوازوں سے نسیاں کی عمارت سحر گوں
لفظ بجتے ہیں' کھنک اٹھتے ہیں' کھو جاتے ہیں پھر
راستہ مفہوم کا تک تک کے سو جاتے ہیں پھر

O

پھر وہی خط
دکھ بھرے لفظوں کی سانسیں تیز تیز
"میرے شاجے
تیری داسی

پیار
کب تک انتظار"
امتحانی پرچے دھاگوں سے بندھے
انبار

ڈھیر
صبح پھر کالج
وہی چہرے
وہی اسباق' میر
مصحفی، غالب

کُتب خانہ کا زینہ پیچ دار
پاؤں پھسلا تھا مرا، ہلکا سا اب تک دَرد ہے
گر رہی ہے اوس
دیکھو ناک کتنی سَرد ہے
آج تو بس میں کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا
موقع پاتے ہی مسافر توڑ دیتے ہیں قطار
بھاگتی سڑکیں
ٹکٹ
گھنٹی
بریک
انجن کا شور
(مَن کے سُر مُرجھا رہے ہیں کس قدر ہے تن کا شور
اے اِدھر اخبار والے!
ویت نام، امریکی بم
دیکھنا ہابیل و قابیل اب بھی ہیں مصروف جنگ
جنگ جیسے وعدۂ امن و اماں کاغذ رِلنگ
رات
مرگھٹ
راکھ کے ڈھیر
آگ
گندھک
کھوپڑی
تاڑ سا قد
لمبے لمبے دانت

دیدے لال لال

سَرسَراتے ناگ

گیدڑ

بھوت

آتش کی جھڑی

آکسیجن

آپریشن

آئیوڈین

نرسیں

پلنگ

سہ لسانی فارمولا

عرصۂ اُردو ہے تنگ

کب خدا جانے سکونِ دل کے لمحے آئیں گے

دل میں کچھ ہونٹوں پہ کچھ

آنکھوں کو نظروں سے عناد

لفظ کو مفہوم سے کب تک بھلا ترسائیں گے

لکھنے پڑھنے کی فراغت

فکرِ نان و آب سے

رُستگاری کب ملے

کیا اتنے دن جی جائیں گے!

عشقِ پیچاں

چاندنی کی بیل

ہرنوں کی کلیل

چادرِ آبِ رَواں

چاندی کی قاشیں پُرگداز

بُرجیوں کا عکس

بہتی سلوٹیں،

جِھلمِل سماں

کُنج میں جھنگارتے مور

اُس طرف

پھول کے چھتنار

میٹھی خوشبوؤں کی سلسبیل

چاندنی — سونے کا پانی

چاند جیسے اشرفی

یہ جہانِ شادمانی اپنی قسمت میں کہاں

پرس میں کتنے روپے ہیں

پہلی کتنی دُور ہے!

دُور، تنہا ابر پارے کا سکوت و اضطراب

ہو بہو بوڑھا رفوگر

ٹوٹی عینک

سَر بہ خم

روز و شب کرتا ہے جو کپڑوں کے زخموں کا حساب

سوئی کے ناکے میں دھاگہ بار پاتا ہی نہیں

میں نے دیکھا تھا کہاں اب یاد آتا ہی نہیں

چاندنی ہے یا کوئی خاکستری دیبا کا تھان

میری تنہائی میں کوئی گنگناتا ہی نہیں

اور وہ لڑکی
مری نظروں سے اوجھل ہو گئی
پھول چُننے والی پگلی کتنے کانٹے بو گئی
مجھ کو دیکھو زندگی سے جی کو بہلاتا ہوں میں
اُون کی گُڑیا کو جیسے بانجھ عورت تھپتھپائے

O

اِک مسلسل گیت کی آواز آتی ہے سُنو
کس کے پاگل گیت کی آواز آتی ہے سُنو
آنسوؤں کی جھیل کی ہلکی سلیٹی سیڑھیاں
سیڑھیوں پر ایک کشتی بادباں کھولے ہوئے
پچھلی شب جیسے نظر آتی ہے گہری دُھند میں
پردے لہراتے ہوئے پتوار پَر تولے ہوئے

O

دُور مٹیالے نشیبوں سے پرَے
جھنکارسی
گھنٹیاں بجنے لگیں
بیلوں کو چرواہے لیے
جارہے ہوں گے
(تو گویا صبحِ کاذب آگئی)
مرمریں گنبد دکھائی دے رہا ہے کوہ پر
یا فرشتہ ہے کوئی ململ کی پگڑی زیبِ سَر
بیٹھے بیٹھے ذہن نے کرڈالے کتنے تجزیئے
دائرے
خط

جدولیں

قوسیں

مثلث

زاویے

صبح پھر آئے گی پیلی خشکیوں کے تھال پر
ازسرِ نو پھر تعارف ہوگا سورج سے کہ میں
روز چہرے کو بدل لیتا ہوں جینے کے لیے
ورنہ یہ آنکھیں بھلا کیا کام آتیں دہر میں
(اِک طلسم خیر و شر ہے آب و گل کے شہر میں)
ایک پیشانی بھلا اور دُور تک ہیں چوکھٹیں
صبح اُٹھ کر اپنی سانسوں کے قرینے کے لیے
ایک پیشانی نئی سر پر سجا لیتا ہوں میں
کل کے چہرے کو بہ آسانی مٹا لیتا ہوں میں
چپکے چپکے مُسکرا لیتا ہوں اپنے حال پر

☆☆

مفاہمت

سُنا ہے زیست سے تم نے نِباہ کرلی ہے
مفاہمت کا یہ سودا کہیں گراں تو نہ تھا
سُبک سَری تو نہ ٹھہری بَلاکشی کے عوض
کوئی فریفتہ کوئی کشاں کشاں تو نہ تھا

O

بتاسکو تو بتادو ہمیں بھی، راز کی بات
یہ بات کیسے بنی، کیسے کاروبار ہوُا
یہ لین دین کا جھگڑا چُکا تو کیسے چُکا
پتہ چلے تو سہی کون کس پہ بار ہُوا
چھِڑے تو ہوں گے پُرانے نئے گِلے شکوے
نگاہ کس کی جھکی، کون شرمسار ہوا
تمہاری کونسی شرطیں تھیں، کیا تقاضے تھے
اُدھر سے کون سا پیمان استوار ہوا
شمارِ حسرتِ ناکام بھی ہُوا ہوگا
اگر ہُوا تو ہمارا بھی کچھ شمار ہُوا!

☆☆

تماشہ

رات جگمگاتی ہے
بھیڑ، شور، ہنگامے
زَرق بَرق پہناوے
سُرخ، سِیم گوں، دھانی
روشنی کے فوّارے
مَرد، عورتیں، بچّے
آڑی ترچھی صَف باندھے
ایک خطِ نوُریں کے
نقطۂ عُمودی کو
سَر اُٹھائے تکتے ہیں
لَو کا جاگ اُٹھتا ہے
ایک لاٹ گِرتی ہے
مَرد، عورتیں، بچّے
تالیاں بجَاتے ہیں
صرف ایک ہی عورت
چیخ روک لیتی ہے
صرف ایک ہی بچّہ
تِلمِلا کے روتا ہے

☆☆

سایہ

کون ہو تم، یہاں کس لیۓ آئی ہو
سرد کمرہ، اُداسی، گھنی خامشی،
آنکھیں دُھندلے دریچوں کی روئی ہوئی
روشنی مضمحل، زَرد رُو جاں بہ لب
نیم تاریک دستر پہ سوئی ہوئی
میز پر کاغذی پھول ہنستے ہوئے
طاق پر مَرمَریں بُت کی تنہائیاں
فرش پر رینگتی، کسمساتی ہوئی
ایک نادیدہ پیکر کی پرچھائیاں
سَبز چوبی پرندے اُڑانوں میں گُم
زندگی کی حقیقت فسَانوں میں گُم
اِک کیلنڈر پہ تاریخ مصلوب ہے
دن کہ گردن میں پھانسی کا پھندہ لیۓ
لمحہ لمحہ کی آنکھوں سے محجُوب ہے
رُک گیا آسماں تھم گئی ہے زمیں،
خَانہ ویرانئ آرزو اور مَیں
اِن میں اب ایک شے بھی تو زندہ نہیں
کون ہو تم یہاں کس لیۓ آئی ہو

☆☆

سوانحِ عُمری

کِدھر آئی ہو، اے بنتِ کلیسا
صلیبوں سے ذرا دامن بچا کر
تمہاری چاپ سے چونکی خموشی
اُداسی، تک رہی ہے سَر اُٹھا کر
یہ سَنّاٹا کسی کی زندگی ہے
جگاتی ہو کسے شانہ ہلا کر
چراغوں کا دُھواں بَل کھا رہا ہے
ابھی شاید بجھے ہیں جھلملا کر
خرام آہستہ آہستہ کہ تم سے
سُنہری زرد پتّے چُرچُرا کر
خزاں کی داستاں دُہرا رہے ہیں
بہارِ رفتہ کی سوگند کھا کر
مجھے اِک شخص کی یاد آ رہی ہے
حیاتِ سادہ کے خاکے بنا کر
وہ پہروں سوچتا تھا جانے کیا کچھ
کھِل اُٹھتا تھا تصوّر کو سَجا کر
وہ اِک چھوٹا سا گھر، ننھا بغیچہ
جہاں ہنستی ہوں کلیاں کھِلکھِلا کر
جہاں ہوں تتلیاں، بھونرے، شگوفے

شفق اُترے جہاں زیور بڑھا کر
جہاں ڈھلوانیں گھیرے ڈالتی ہوں
جہاں جاتے ہوں رستے پیچ کھا کر
نشیبوں سے پرے جھیلوں کا بلور
شعاعیں دے رہا ہو چم چما کر
سرِ دیوار آبی رنگ پارے
چمک اُٹھیں نظر کی داد پا کر
وہ ہلکی نیلی دیواروں کے کمرے
سجایا جن کو خوشبو میں بسا کر
جڑے ہوں خواب کے آئینے ہر سُو
جہاں تعبیر خوش ہو عکس پا کر
کتابیں میز پر بکھری پڑی ہوں
رکھے کوئی قرینے سے لگا کر
جہاں ہنستا ہو ننھا پالنے میں
دھنک کے آڑے ترچھے رنگ اُڑا کر
شریکِ زندگی معصوم و سادہ
جھروکے میں کھڑی ہو لَو لگا کر
کسی کی راہ گویا تک رہی ہے
تردّد کو محبت میں چھپا کر
دبے پاؤں دَر آیا کوئی گھر میں
سراپا عجز کی صورت بنا کر
سببِ تاخیر کا سمجھا رہا ہے
کوئی اَن جان ہے سب سُن سُنا کر
کسی کا رُوٹھ جانا سر سے پا تک

منا لینا کسی کا مُسکرا کر
انگیٹھی کے کنارے نرم باتیں
غزل کے شعر کی تمہید اُٹھا کر
شرارت سی کسی کو سُوجھتی ہے
سرکتا ہو کوئی پلّو چھڑا کر
مصوّر اس خیال و خواب کا اب
یہاں سویا ہوا ہے سب لُٹا کر
یہ کتبہ وعدہ و قول و قسم کا
ذرا تحریر دیکھو پاس آکر
کسی کو پا کے کوئی کھو نہ بیٹھے
کسی کو کھو چکا ہے کوئی پاکر
کھڑی ہے سَر برہنہ کوئی تعبیرؔ
حریری خواب کو کفنی پِنھا کر
ہر اِک لفظ آخرِ شب چیختا ہے
رُخِ مفہُوم سے پردہ ہٹا کر
برس پڑتے ہیں کچھ پھُول آسماں سے
گذرتی ہے صبَا آنسو بہا کر

☆☆

مخدومؔ کی یاد میں

وہ لوگ اپنا درد تیرے پاس لے کے آئے تھے
وہ لوگ کون تھے بھلا
پریشاں حال، خاطرِ اُداس لے کے آئے تھے

O

وہ نوجوان کون تھا
جو ٹکڑے ٹکڑے آئینے کے تک رہا تھا فرش پر
جو دانہ دانہ چُن رہا تھا خرمنِ خیال کا
لہُو اُمید و بیم کا چمک رہا تھا فرش پر
کہ زندگی کے راگ سُر تو تیرے پاس رہ گئے
وہ کیمیا کے سارے گُر تو تیرے پاس رہ گئے
ادھورے خواب سونپ کر
کہاں چلا گیا ہے تُو
بُجھی بُجھی ہے روشنی
دُھواں دُھواں ہیں بام و دَر
پُکارتی ہے رہ گذُر
کہاں چلا گیا ہے تُو

O

وہ طفلِ نودمیدہ کون تھا
سُنا رہا تھا جو کتابِ عہدِ نو وَرق وَرق

بیاضِ فردا لکھتے لکھتے ہاتھ کیوں اُٹھالیا
قلم کسی نے دیکھتے ہی دیکھتے چُرالیا
دوات چھن سے ٹوٹ کر بکھر گئی

حروف کھو کے رہ گئے

معانی رو کے رہ گئے

ادھورے خواب سونپ کر

کہاں چلا گیا ہے تُو
بجھی بجھی ہے روشنی

دُھواں دُھواں ہیں بام و دَر

پُکارتی ہے رہ گذر
کہاں چلا گیا ہے تُو

O

وہ ایک لڑکی کھیت کی سُنہری مانگ سے پرَے
جو جانتی نہیں ہے تیرے نام کی مِٹھاس بھی
مگر وہ مینہہ کی رُت کے پہلے پہلے بادلوں کی اوٹ سے
مگر وہ جھومتے جھمکتے ڈنٹھلوں کی اوٹ سے
کھڑی ہوئی فصیلِ فصل کے حصارِ زرد زرد سے
سُنہری شوخ بالیوں کی مہکی مہکی گرد سے
وہ سُن رہی ہے تیری چاپ، تیری آہٹیں ابھی
اُمید، آس، آرزو کی گنگناہٹیں ابھی

ادھورے خواب سونپ کر

کہاں چلا گیا ہے تُو
بجھی بجھی ہے روشنی

دُھواں دُھواں ہیں بام و دَر

پکارتی ہے رہ گذر
کہاں چلا گیا ہے تُو

O

وہ دستِ رعشہ دار کون تھا
کہ جس کی جھرّیوں کی ایک ایک نَس پکارتی رہی
ترے جواب کے لئے وہ بس پکارتی رہی
ردائے سر کہاں گئی
عصائے پیری کیا ہوا

O

رُتیں پھریں گی ہر برس
بہاریں چل کے تیرے پاس آئیں گی
ہوائیں رُخ بدل بدل کے تیرے پاس آئیں گی
گھنیرے ابر موتیوں کے طشت بھر کے لائیں گے
وہ کُنجِ گُل میں سبز و سرخ روشنی گلاب کی
رُتیں پھریں گی ہر برس
وہ خشک خشک پتّیوں پہ لُو کی سرسراہٹیں
اکیلی دو پہر میں فاختہ کی ہُوک سے
سکوت کے بدن میں جیسے ہوں گی تھرتھراہٹیں،
قطار در قطار لفظ تیرے پاس آئیں گے
کہیں گے رو کے شعر کا عطا ہو پیرہن ہمیں
بھٹک رہے ہیں در بہ در کرو نہ بے وطن ہمیں
میں تارِ اشک و خونِ دل پرو رہا ہوں دیر سے
تجھے سپردِ خاک کر کے رو رہا ہوں دیر سے
تری مثال جیسے آبِ چشمہ رواں رہی

تُو دوسروں کے رُخ کی گرد دھو کے مطمئن رہا
ہنسی کا تیری ذکر کیا تُو رو کے مطمئن رہا
تُو شبنمیں نگاہ سے اُجالے دیکھتا رہا
تُو روزنِ سیاہ سے اُجالے دیکھتا رہا
مَتاع تیری مُشتِ خاک اور تُو چمن چمن
نفاستِ حَریر تُو مگر دریدہ پیرَہن
قدم قدم پہ نعمتوں کو تیرا انتظار تھا
نہ جانے کتنے بیلگوں دریچے تھے کُھلے ہوئے
نہ جانے کتنی شمعیں تیری راہ تک کے سو گئیں
تری نظر تھی اُس چراغِ خانہ سیاہ پر
کہ دے رہی تھی جس کی لَو ترے لہُو کا واسطہ
ترے مزاجِ آتش و شرارہ جو کا واسطہ
تُو فرد کب تھا' بزم تھا' حیات تیرے ساتھ تھی،
زمانہ تیرے ساتھ' کائنات تیرے ساتھ تھی
زیاں کے سوُد، سُود کے زیاں کی داستاں تری
وہ سَیر چشمیاں تری
وہ محفلیں، وہ رت جگے، وہ جشنِ مَے وہ قہقہے
وہ یار باشیاں تری
تکلّمِ شگفتہ و تبسّمِ نگاہ میں
وہ دل نوازیاں تری
نہیں کہ آج دوسرا کوئی نہیں ہے دَہر میں
سحر کے ساتھ یہ خلش کہ تُو نہیں ہے شہر میں
وہ دُکھ کی گھات، سُکھ کی بات' کس سے جا کے پوُچھیئے
صنم کدہ کھنڈر بنا ہے کس سے کیجئے گلہ

اُجڑ گیا ہے سومنات، کس سے جا کے پوچھیے
سُخنوری بھی ہے، بہت پیمبری بھی ہے، بہت
طلسمِ صوت و نغمگی کی ساحری بھی ہے، بہت
مگر مرے دکن ترری بساطِ رقص اُلٹ گئی
میں رو رہا ہوں، شہ رگِ رباب و چنگ کٹ گئی
مری زمیں دہل گئی کہ آسمان ڈھ گیا
کہ سیلِ اشک و آہ میں عجیب قصر بہہ گیا
سجے گی یوں تو بارہا سخن کی انجمن یہاں
کہ اِقتضائے دہر بھی ہے کتنا دل شکن یہاں
مگر کلید رونقِ ہر انجمن تو کھو گئی
دکن کی قسمتِ سخن تو تیرے ساتھ سو گئی
گلی گلی، نگر نگر میں تجھ کو ڈھونڈتا پھروں
شفق شفق، سحر سحر میں تجھ کو ڈھونڈتا پھروں
"وہ رُوپ رنگ راگ کا پیام" دے کے کھو گیا!
"وہ کام دیو کی کمان جام" دے کے کھو گیا!!

☆☆

چاند پھر نکلے گا

چاند پھر نکلے گا، پھر تیرے خدو خال کا رنگ
یاد آئے گا، مجھے نیند نہیں آئے گی

دل بہت روئے گا آنسو نہیں پونچھے گا کوئی
جاں یہ بن جائے گی، دیوار و در و بام مجھے
بھینچ لیں گے، مری تنہائی نہ دیکھے گا کوئی
آنکھیں (موہوم اُجالے کے پُراسرار کھنڈر)
راہ تکتی چلی جائیں گی نہ لوٹے گا کوئی

رات بھر پھر مرے ارماں کا یہ بے تاب چراغ
جھلملائے گا، مجھے نیند نہیں آئے گی

ہر مہینے یونہی یہ درد کی فصل آئے گی
چاند آ آ کے کرے گا مرے زخموں کا حساب
مطمئن ہو کے شبِ ماہ پلٹ جائے گی
کہ ابھی اور تمنا مجھے تڑپائے گی!!

چاند پھر دائرہ سے زاویہ ناخن تک
گھٹتا جائے گا مجھے نیند نہیں آئے گی

☆☆

ظُلمت سے پرے

اِک دستِ شکستہ سازِ کُہن
تم سُن نہ سکو، میں گا نہ سکوں
پچھتائے ہوئے اشک عُمر ہوئی
اب چاہوں تو پچھتا نہ سکوں

میرے بھی فلک پر شمس و قمر
چمکے تھے چمک کر گہنائے
میں نے بھی ستارے ٹانکے تھے
سب ٹوٹ گئے سب کُجلائے

شبنم سے لکھے تھے کچھ نغمے
پانی پہ لکیریں کھینچی تھیں،
پتھر سے پھول کھِلائے تھے
اشکوں سے زمینیں سینچی تھیں،
اِک شاخ چُنی، کچھ ہار بُنے
وہ ساری لڑیاں ٹوٹ گئیں،
میں جن سے شفق کو چھوتا تھا
رنگوں کی وہ کڑیاں ٹوٹ گئیں،

دیکھو، یہ چراغ کشتہ ہیں،
سب اِن کے اُجالے بیچ دیئے
آنکھوں کا تبسّم لُٹ سا گیا
قِسمت کے قبالے بیچ دیئے

کچھ خواب تھے میری جھولی میں،
اُن خوابوں کا نیلام اُٹھا
اب تم سے کہوں کیا جینے کا
کِس مشکل سے اِلزام اُٹھا

دیکھو تو اُدھر، ظلمت سے پَرے
ماضی کا مہَاجن بیٹھا ہے
سب رہن ہیں، میرے روز و شب
تم لے آؤ تو اچھا ہے

☆☆

ہم اپنا حسابِ غم چُکالیں

اب مجھ سے مِلو تو کیوں ملو تم
لیکن کبھی اتفاق ہو تو
مانو، کہ نہ مانو پھر بھی سُن لو
نسیاں کی دُھواں دُھواں زمیں پر
ہم اپنا حساب غم چُکالیں،
پھر اپنی بساطِ درد اُٹھالیں

O

کچھ میرے ادھورے گیت شاید
ہونٹوں پہ تمہارے رہ گئے ہیں،
کچھ حرفِ وفا، تمہارے دل کی
دھڑکن کے سہارے رہ گئے ہیں
کچھ تم نے سِکھا دیا تھا جینا
کچھ عادتیں مجھ میں ہیں تمہاری،
جن کی تمہیں خود خبر نہیں ہے
وہ نکہتیں مجھ میں ہیں تمہاری
کچھ ایک سے ہیں غموں کے چہرے
چہروں کی شباہتیں مِٹالیں،

ہم اپنا حسابِ غم چُکالیں
پھر اپنی بساطِ درد اُٹھالیں،

O

بازارِ وفا میں بھیڑ سی ہے
جگ مگ سی ہیں درد کی دُکانیں،
سُرخ آرزوؤں کی روشنی ہے
خوابوں کے مجسّمے کھڑے ہیں
اطراف ہیں نیلے نیلے ہالے
بِلّور کی کھڑکیاں، دریچے
شیشے کے چمکتے طاق، زِینے
پھیلے ہیں شفق شفق اُجالے
کچھ یاد ہے تم کو اِک دُکاں پر
کس خواب کی آرزُو میں ہم نے
بیعانۂ اشک دے رکھا تھا
اُس خواب کے سامنے ٹھہر کر
کچھ دیر کو اپنا سَر جھکالیں

ہم اپنا حسابِ غم چُکالیں،
پھر اپنی بساطِ درد اُٹھالیں،

☆☆

لوگو

لوگو نہ بُرا مانو مجھ سے
اچھا نہیں اتنا پتھراؤ
یہ باتیں کل پھر دُہراؤ
ہر ایک گرہ کھل جائے گی
مفہوم سمجھ میں آئے گا

O

نوخاستہ شاخ کا پھل ہوں میں
جو پہلے پہل بازاروں میں
کچھ قبل از موسم آتا ہے
ترشی بھی گوارا ہوتی ہے
قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے

☆☆

وعدہ

بھٹک رہے ہیں فراموشیوں کے کُہرے میں،
دِلوں میں یادِ شب گُم شدہ جگائے ہوئے
سُلگتے بجھتے ہوئے، دُور آس کے جگنو
تمہاری راہ میں کب سے ہوں میں ستارہ بکف
محبتوں کے زمانے کا بوجھ اُٹھائے ہوئے
غلط نہ سمجھو، مرے غم کا اعتبار کرو
گھنیری شام جہاں دونوں وقت ملتے ہوں
شفق کے زینہ پہ تم میرا انتظام کرو

☆☆

اور پھر یُوں ہُوا

اور پھر یُوں ہُوا، دِن گذرتے گئے
اُس نے سوچا کہ رُسوائی کیوں مول لیں،
کیوں نہ سونپی ہوئی دولتیں چھین لیں
دُوریاں بخش دیں، قُربتیں چھین لیں
میں نے پھر دل سے در تک کے سب راستے
وا کیے، ساری پُونجی کو یکجا کیا
کیسی تہذیب، کیسا کھنڈر بن گئی!
ہائے کس سلطنت کو زوال آگیا
چار سُو غم کے شب خُون کی فوج تھی
چار سُو نارسائی کے لشکر ملے
اِک ارم دُور تک زیرِ تعمیر تھا
دُور تک خشک گہرے سمندر ملے
چند صُبحیں ملیں، ایک سُورج ملا
چند شاموں کی آنکھوں میں سُرخی مِلی
چند راتوں کی کچھ چاندنی سی مِلی
نیم قوسیں ملیں، قُرصِ مہتاب کی
میری بیدار آنکھوں میں گُھلنے لگیں
کانپتی، دُھندلی پرچھائیاں خواب کی
ناز کے قصر پر کوئی آہٹ ملی

راز کے ریشمیں، سُرخ پردے ہلے
درد کے قیمتی پتھروں کے تلے
اشک کے موتیوں کے خزانے مِلے
پھر سے جینے کی جیسے للک جاگ اُٹھی
میری خوابیدہ تقدیر تک جاگ اٹھی
ہوش آیا تو اپنے لبوں پر مجھے
ایک ہاری ہوئی مُسکراہٹ مِلی

○

دل نے پھر اپنا شیرازہ برہم کیا
غم نے روکا، مگر جاں نے ماتم کیا
میں نے کیا جانے کیا کیا اُسے تج دیا
وہ کھلونے ابھی تک جو ٹُوٹے نہ تھے
اُن سوالوں کو بھی میں نے لَوٹا دیا
جو مِرے عشق سے اُس نے پوچھے نہ تھے
میں نے وہ روز و شب بھی اُسے دیدیئے
جو مِرے تھے، مگر صرف میرے نہ تھے
میں نے وہ کشتیاں بھی اُسے بخش دیں
بادباں جن کے اب تک لپیٹے نہ تھے
سارے پَتوار قُرباں کیئے، جن کے تَن
دھوپ میں ریگِ ساحل پہ سُوکھے نہ تھے
میں نے وہ رہگذر بھی اُسے سونپ دی
جس پر اُس کے نشانِ کفِ پا نہ تھے
میں نے ایسے بھی سَناٹے واپس کیئے
ہم جہاں ساتھ رہتے تو تنہا نہ تھے

میں نے وہ ساری سرگوشیاں پھیر دیں
جن کے الفاظ میں آج تک جان تھی
اِک کھنک اُس کے لہجہ کی محفوظ تھی
جو مِری رُوح و دل کی نگہبان تھی
میں نے اِن موتیوں کو بھی بکھرا دیا
عشقِ تنہا کو کچھ اور تنہا کیا

O

اور پھر یوُں ہُوا، دن گذرتے گئے
یاد کی شہ رگوں کا گنوارا لہُو،
مقتلِ وقت کے فرش پر سوگیا
یاد کی شکل پر جھرّیاں آگئیں،
یاد کی آنکھ کا نُور کم ہوگیا!
یاد کی پُشت خم ہوگئی، ہاتھ میں
اِک عصائے فراموش گاری لیے
یاد لمحوں کے سیلاب میں کھو گئی
یاد آہستہ آہستہ گُم ہوگئی!

☆☆

سَفر

سیاحتِ ذات پُرخطر ہے
رِدائے شب، دُور تک سمندر
لہُو کی موجوں کی رہ گذر ہے
امید کا چاند وَہم کے
بادلوں میں چھپ چھپ کے نوحہ گر ہے
شکستہ کشتی، ہوا مخالف،
ضمیر و حالات کا بھنور ہے
لبوں پہ مانجھی کے گیت زخمی،
فضا میں بجتی ہیں سِیٹیاں سی
یہ شورِ طوفانِ خیر و شر ہے
اگر کوئی ڈوب جائے اس میں
تو تہ نشینی سے کب مَفر ہے
اگر کوئی پار اُتر گیا تو'!
جزیرہ عرفان و آگہی کا
سُنا ہے، صدیوں سے مُنتظر ہے

☆☆

برف باری

زمستاں کی رُت، نیم شب، برف باری
بہ حدِ نظر تھر تھراتی ہوئی لَو
فضائے دل و جاں کی شیون گذاری
درختانِ رفتہ ہواؤں کی زد پر،
خزاں دیدہ پتے سسکتے ہوئے سے
ٹھٹھرتی ہوئی چاندنی، کانپتی ضَو
دریچوں کے شیشے دَرکتے ہوئے سے
کوئی چیخ، آواز، جھنکار، نغمہ،
روانیِ خُون گلُو تھم رہی ہے
کرُیدو انگیٹھی کا سینہ کُریدو
مری آگ پر راکھ سی جم رہی ہے

☆☆

ریزہ ریزہ

وہ ایک لڑکی کہ طائرِ خوش نوا
خزاں میں، غزالِ وحشت رسیدہ جس پر
خُتن خُتن جیسے ہنس رہے تھے
وہ ایک بدلی کہ جس سے بُوندیں
برس نہ پائیں، تو سیپ کے لب ترس رہے تھے
وہ ایک ناگن جو، ہر سپیرے کی
دُھن پہ بدمست ہو رہی تھی،
وہ جاگتی تھی کہ صاحبانِ کہف کے
غاروں میں سو رہی تھی،
رَواں دَواں عمر کے آئینہ کو پیہم
غرور و نخوت کے پتھروں سے

کُچل کُچل کر وہ کور چشموں کے جیسے سُرمہ لگا رہی تھی،
وہ اب بھی میٹھے برس کے خوابوں سے زندگی کو رِجھا رہی تھی

وہ چہرہ تھا رائج الوقت سِکہ
مگر کسی ایسی سلطنت کا جو ہاتھ سے کوئی پَل میں نکلے
بدن کی قوسیں کہ دستِ پرکا رِسال دِسن تھرتھرا کے سنبھلے

میں اُس کی ظلماتِ رُوح میں کل پئے سیاحت اُتر پڑا تھا
وہ شور تھا، بھیڑ تھی وہ ریلا
وہ کوئی کُہرام تھا کہ میلا
میں محوِ نظارہ تھا، اکیلا
کہ یوں بھی انجان اجنبی تھا، سَراپا حیرت بنا کھڑا تھا

پھر اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا
قطار اندر قطار پتھر کے بُت کھڑے مُسکرا رہے تھے
وہ دیوداسی بدَن چُرائے
لجائے، شرمائے، رَسمسائے
چٹکتی پوروں کا پیار لے کر
کنواری کلیوں کا ہار لے کر
وہ جب چرَن چھونے جھک رہی تھی تو بُت شوالے سے جا رہے تھے
پھر اپنی آنکھوں سے مَیں نے دیکھا
بلور کی ہفت رنگ گویا
زمین پر چھن سے گِر پڑی تھی
وجود کا ریزہ رِیزہ چُن کر
برہنہ تن بے کفن کھڑی تھی

☆☆

پتھراؤ کی چومکھ برکھا میں!

میں زخمی زخمی لہو لہو
ہر جنگل ہر آبادی میں
کانٹوں کے نکیلے رستوں پر
پھولوں کی رُو پہلی وادی میں
ہر شہر میں ہر ویرانے میں
ہَر شور میں ہر سَنّاٹے میں
آواز لگاتا پھرتا ہُوں
کوئی تو خریدار آئے گا
مقتل کی سُنہری چوکھٹ تک
بِسمل کا طرفدار آئے گا
اِک آس لیئے اُمید لیئے
دامن میں مہَ و خورشید لیئے
پتھراؤ کی چومکھ برکھا میں
خوابوں کو بچاتا پھِرتا ہُوں
بے رحم حقیقت مِلتی ہے
میں آنکھ چُراتا پھِرتا ہُوں

O

اکثر یہ تمنا جاگی ہے
(گویا میں چہکتا بالک ہُوں)

تِتلی کے رنگیں پنکھوں پر
للچائے ہوئے بَن بَن گھوموں
ہر کُنج میں خوشبُو پی پی کر
گُنجار میں بھونروں کی جھُوموں
ہر بھور بھئے ہر سانجھ بھئے
چہکار میں چڑیوں کی ڈولوں
فطرت سا سَخی تو کوئی نہیں
نظروں سا دھنی تو کوئی نہیں
یہ پیڑ یہ پربت یہ ساگر
دھرتی پہ کِھلونے رکھے ہیں

O

یہ دریا، پرتیں چاندی کی
اَمرت کے دَونے رکھے ہیں
مَیں امرت پینے رُکتا ہوں
دریا کے تٹ پر جھُکتا ہوں
پانی میں کوئی پرچھائیں
پھُنکارتی ہے ڈس جاتی ہے
خوابوں سے مجھے چونکاتی ہے

O

اکثر یہ گُماں ہوتا ہے مجھے
مَیں ایک چمکتا جگنو ہُوں
شبنم کی ننھی بوندوں کو
پھُولوں کا گھر دکھلاتا ہُوں
مَیں شب کے اندھیرے سینے میں

نیکی کی کرن بن جاتا ہُوں
جب پَو کی روشنی آتی ہے
پھنکارتی ہے ڈَس جاتی ہے
خوابوں سے مجھے چونکاتی ہے

O

اکثر یہ گُماں ہوتا ہے مجھے
بُت ساز ہُوں میں ہر پتھر سے
دیرینہ شناسائی ہے مِری
چلّاتا ہے کوئی اندر سے
ہر سنگ میں اِک بُت خانہ ہے
جس شے کو پتھر کہتے ہو
وہ صوُرت کا بیعَانہ ہے
ہر سنگ سے پھر بُت ڈھلتے ہیں
ہر بُت کو زباں مِل جاتی ہے
میں پہروں اُن کی سُنتا ہُوں
خوش ہوتا ہوں سَر دُھنتا ہُوں
دُنیا کو مگر فرصت ہی کہاں
آواز مِری گھُٹ جاتی ہے
خوابوں سے مجھے چونکاتی ہے

O

داناؤں کی اِس نگری میں
یہ بہکی بہکی کون سُنے
سَرِ چیخ کی پھانسی پر ہو جہاں
سَر خاموشی پر کون دُھنے

میں کس بستی کا باسی ہُوں
کیا کہتا ہُوں کیا سُنتا ہُوں
اِن گیتوں کے کھلیانوں سے
کیوں موتی موتی چُنتا ہُوں
پتھراؤ کی چونکھ برکھا میں
ہر موتی ٹُوٹا جاتا ہے
خوابوں سے مجھے چونکاتا ہے

☆☆

خدا کرے

خدا کرے کہ پلٹ آئیں پھر وہی دِن رات
ترے خیال کی خوشبو سے سانس رُکنے لگے
کہ تیرے نام پہ چہرے کا رنگ اُڑ جائے
کہ تیرے ذِکر سے پہلوئے ضبط دُکھنے لگے

O

پھر ایک بار یہ دُنیا تمام دشت بنے
اُتر چلے کسی نشتر کی طرح سنّاٹا
مرے وجود کے پتھر کی طرح سنّاٹا

O

تری صدا کہیں پردوں سے سایہ سایہ چھنے
سکوتِ شام ہو تیری وفا کو جی ترسے
جلیں لبوں کے کنارے دُعا کو جی ترسے

☆☆

بارِ دگر

اُتر آئی ہے گہری شام صدیوں کے لبادے میں
شجر خاموش ہیں، سَنولا گئی شاخوں کی برنائی
یہ گلشن باعثِ افزائشِ احساسِ تنہائی
میں کب سے چُپ کھڑا ہوں سِن رسیدہ پیڑ کے نیچے
غبارِ سُرمگیں، سناٹا، رنجِ بے سَر و ساماں
یہ آنکھیں، انتظارِ کاروانِ گُمشدہ جیسے
میں آنے والے یا بیتے دنوں کی چاپ سُنتا ہوں

O

مُسلسل جیتے جیتے کون تھکتا ہے مگر پھر بھی
کبھی یہ زندگی بیکار سی معلوم ہوتی ہے
قدم اُٹھتے نہیں زنجیرِ ارماں کتنی بھاری ہے
رسن، آسودگی پر بھی نفس کی آمد و شُد ہے
غرض اِک نشۂ بے نامِ صہبا ہم پہ طاری ہے
نظر کے سامنے ہیں سینکڑوں رنگین تصویریں
طلسمِ خواب کی دیوار سی معلوم ہوتی ہے
یہ نقشِ زندگانی عارضی کیا، مستقل کیا ہے
یہ دُنیائے جواں شیرازہ بندِ آب و گِل کیا ہے
بدن کی رُوح کی تکرار سی معلوم ہوتی ہے

O

کٹی کچھ پالنے میں چاند سے سرگوشیاں کرتے
سُہانی لوریوں کے رَس میں راتیں رَسمساتی تھیں؛
کبھی گھٹنوں چلے تو تتلیوں کے رنگ پر رِیجھے
رسیلے چہچہے چڑیوں کے، بھِن بھِن شوخ بھونروں کی
اذانیں پَو پھٹے، کوئل کی چہکاریں جگاتی تھیں؛
گھنے باغوں کی سُونی دوپہر میں فاختاؤں کی
صدائیں، اور سَنّاٹے کو گہرا کرتی جاتی تھیں؛
کنویں کی میڈھ پر بیلوں کی جوڑی، گھومتی چرخی
وہ تھم تھم کر نشیبوں پر رِدائیں جیسے موتی کی!
وہ سیرابی کہ دل میں کیاریاں پھل پھول لاتی تھیں؛

O

شکر خوابی سے چونکے، مدرسہ کی گھنٹیاں گونجیں؛
اندھیری رات میں لفظوں کی، معنی ڈھونڈنے نکلے
کتابوں کے ورق، دانشِ کی لَو، پوروں کی جنبش تھی
غرض اِک آگہی کی منزلِ موہوم تک پہنچے
یہاں تھی دھوپ سر پر اور ہم چھتنار بھول آئے
یہاں تھی تشنگی اور اوک بھر تھا اپنا مشکیزہ
کتابوں میں لکھا تھا کچھ، یہاں کچھ اور ہی دیکھا
کوئی قامت نہ تھا، بے قامتی کے سب کے سب سائے
یہی تھی زندگی، اب کون سمجھے کس کو سمجھائے

O

نِکل آیا ہے پیلا چاند مشرق کے کناروں سے
بَراتیں نُور کی، نکہت کی جیسے چوکیاں اُتریں
گُل و برگ و شجر پر کیفیت ہے نیم خوابی کی

یہ میداں کا دُھندلکا، کاش اُدھر سے قافلہ آئے
''مِری تعمیر میں مُضمر ہے اِک صورت خرابی کی''
میں آنے والے یا بیتے دِنوں کی چاپ سُنتا ہوں
وہ آنے والے دن، بارُود، آتش، زلزلے، نوحے
اگر ہوں گے تو اُن کے پاؤں میں زنجیر پہنا دیں
مجھے بیتے دنوں کا پالنا کب سے بُلاتا ہے
مِرا جی چاہتا ہے از سَرِ نو زندگی کرلوں

☆☆

نِسیاں کی عمارتِ شکستہ

نِسیاں کی عمارتِ شکستہ

چُپ چاپ، اُداس، سَر جھکائے
مبہُوت، خراب حال، گُم سُم
کُہرے کی رِدا میں مُنہ چھپائے
وقتِ گُوراں کو تک رہی ہے
لمحوں کے بَدن کی رُوح جیسے
کھنڈروں میں کہیں بھٹک رہی ہے

O

دالان، سُتون، سقف، زینے
کرتے ہوئے سائیں سائیں جیسے
رہ رہ کے کہیں کوئی پرندہ
بولے تو فضا کی سانس ٹُوٹے
اعضا شِکنی سکوتِ شب کی
یہ نیم قمر یہ زَرد محراب
سناٹے کی تھرتھراہٹوں میں
جھنکاریں ہیں محوِ راحتِ خواب

O

جب پچھلے پہر ہوا کا جھونکا
سنکے تو دریچے چَر چَرائیں،

زنجیر کا کرب کسمائے
پرچھائیاں صَف بہ صَف نکل آئیں
پرچھائیاں، سُرخ، سَبز، نیلی
نارنجی، بسیئ، سفید، پیلی
دُھندلاہٹیں، سوچ، ہُو کا عَالم
سب شہر و دیار لُٹ گئے ہیں،
کس طرح ہوئے صَدا بہ صحرا
وہ لوگ جو مجھ سے چھُٹ گئے ہیں!

☆☆

ظُلمات

(ہند و پاک کے اربابِ اقتدار کے نام)

یہ شب سکوت کے گنبد کی سَرسَراہٹ سی
سیاہ پوش ہیں، آسیب کی لَویں جیسے
دھمک سی خوف کی، پرچھائیوں کی آہٹ سی
کراہتی ہوئی بے خانماں ابابیلیں
کہ جیسے موت کے شہپر کی پھڑپھڑاہٹ سی
دریچے کتبوں کے مانند، بے زباں گُم سُم
فضا اُداس، مکیں مُضطرب مکاں گُم سُم

یہ اہلِ شہر ہیں لَب بَستہ، پابہ گِل، مبہُوت
کھڑے ہیں راندۂ درگاہِ خیر و شر کی طرح
دِلوں کے طاق پہ شمعوں کی لَو بڑھائے ہوئے
یہ نصیب نہیں ہیں، یہ اپنے گھر کی طرح
کوئی نہیں شبِ مقتل میں بولنے والا
دِلوں کا ساتواں دَروازہ کھولنے والا
دِلوں میں نُور ہے، جگنو ہیں، پھُلجھڑی جیسے
جڑی ہے کاہکشاں کی کوئی لَڑی جیسے
دِلوں میں قافِ طلسمات، سحر، جادُو ہے
دِلوں کے کوچے میں شہنائیوں کے لہرے ہیں

دِلوں کے رنگ ہیں جتنے، تمام گہرے ہیں
دِلوں میں بجتے منجیرے، کھنکتے گھنگھرو ہیں
دِلوں میں غم کے تبسّم، خوشی کے آنسو ہیں
گجر کی گونج، شعاعیں، رمیدہ خوشبوئیں
طلوعِ مہر، چکاچوند، چاند کی قاشیں
فرازِ آب کہیں ہے، کہیں نشیبِ سَراب
چمکتے جاتے ہیں بیداریوں کے روشن خواب
دِلوں کا عرصۂ لالہ فشاں یہ کہتا ہے
ہزار بیج زمیں کی پرت میں آسُودہ
نہالِ سبز پہ تُلنے کے انتظار میں ہیں
دِلوں کے تٹ کا سہانا سَماں یہ کہتا ہے
سفینے بادباں کھلنے کے انتظار میں ہیں
صَدف امانتِ پہلو سے بے بہا جیسے
گُہر نگاہ پہ رُلنے کے انتظار میں ہیں

دِلوں میں آتشِ گُل ہے، دُخان و دُود نہیں
کہ رنگِ سُرخ لہُو ہی نہیں، حِنا بھی ہے
کہاں سمجھتے ہیں دِلدادگانِ ظلمتِ شب،
فروغِ حُسنِ سیہ چشم سُرمہ سَا بھی ہے
اب اُن سے کیا کہیں جو شہ رگِ شفق کاٹیں
اب اُن سے کیا کہیں جو چاندنی میں وِس بوئیں
اُتارتے ہوں جو خنجر گلوئے نغمہ میں،
وہ پچھلی رات کا سنگیت سُن کے کیوں روئیں
اب اُن سے کیا کہیں عُمرِ دو روزہ کیا شے ہے

بدلنے لگتے ہیں پَل بھر میں کوکب و آفاق
کبھی تو لمحوں میں صدیاں گذُرنے لگتی ہیں
خیال و خواب کے پردوں پہ عکس پڑتے ہیں
وہ کون صوُرتیں ہیں کیوں اُبھرنے لگتی ہیں
اب اُن سے کیا کہیں عُمرِ دو روزہ کیا شَے ہے
جھکے نگاہ تو کس طرح نوُر چھنتا ہے
بجے کلائی تو جھنکار کیسی ہوتی ہے
کسی حبیب کا، شانے پہ لمسِ نرم ہے کیا
کسی پڑوس کی دیوار کیسی ہوتی ہے

اب اُن سے کیا کہیں عُمرِ دو روزہ کیا شَے ہے
بنے نہ دانۂ تسبیح پاؤں کی زنجیر
کتابِ نوُر کا جُزداں کہیں کفن نہ بنے
طلسم کاریٔ زُنّار خوب ہے لیکن
گلو کے حق میں کہیں حلقۂ رسَن نہ بنے!

☆☆

غزلیں

○

اِک آگ ہے کہ جو ڈھلتی ہے آبگینے میں،

○

چلے طائر اُڑ کے پسِ شفق، ہے اُداس اُداس رُخِ اُفق
کہ بیاضِ شام کا ہر وَرق، تری داستانِ دراز ہے!

○

O

آبلہ پائی سے ویرانہ مہک جاتا ہے
کون پھولوں سے مرا راستہ ڈھک جاتا ہے
مصلحت کہتی ہے وہ آئے تو کیوں آئے یہاں
دل کا یہ حال، ہر آہٹ پہ دھڑک جاتا ہے
کیا سرِ شام نہ لوٹوں گا نشیمن کی طرف!
کیا اندھیرا ہو تو جگنو بھی بھٹک جاتا ہے
ایک دیوانہ بھٹکتا ہے بگولا بن کر
ایک آہو کسی وادی میں ٹھٹھک جاتا ہے
کوئی آواز کہیں گونج کے رہ جاتی ہے
کوئی آنسو کسی عارض پہ ڈھلک جاتا ہے
قافلہ عمر کا پیہم سفر آمادہ سہی،
شجرِ سایہ فگن دیکھ کے تھک جاتا ہے
شاذؔ اس کوششِ تمکیں پہ بہت ناز نہ کر!
یہ چراغِ تہِ داماں بھی بھڑک جاتا ہے

☆☆

O

ہر قافلے سے رابطۂ مختصر رہا
میں مدّتوں غبارِ سرِ رہ گزر رہا

مانا کہ گفتگو میں نہ تھا حسرتوں کا رنگ
لہجے پہ تیرے غم کا برابر اثر رہا

ہر راستے پہ جیسے بھٹکے سا گیا ہُوں مَیں
ہر راستے پہ کیوں ترے ملنے کا ڈر رہا

کیا کیا خیال صُبح سے آتے ہیں خیر ہو
وہ چہرہ میری آنکھوں میں کیوں رات بھر رہا

کس دل سے ہم نے چھوڑ دیا شہرِ آرزو
دشمن بھی تھوڑی دُور رفیقِ سفر رہا

☆☆

O

زندگی ہم نے گذاری تو کہاں گذری ہے
کچھ نہ کچھ بات طبیعت پر گراں گذری ہے

گھر وہ تاریک خرابہ ہے کہ جی ڈرتا ہے
اپنے محبوب کی آمد بھی گراں گذری ہے

اتنی ہلچل تہِ گرداب نہیں ہوتی تھی
پھر مرے سر سے کوئی موجِ رواں گذری ہے

یوں نہیں آئے ہیں یہ صبر وسکوں کے انداز
عمر گذری ہے تو آنکھوں سے نہاں گذری ہے

سنگدل تھے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا ہم نے
بارہا راہ میں شیشہ کی دکاں گذری ہے

وضع داری نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
ایک ہی پہلو سے گذری ہے جہاں گذری ہے

ٹوٹ کر رہ گئی سینہ میں کہیں نوکِ ہلال
بڑی تکلیف سے عیدِ رمضاں گذری ہے

☆☆

O

مِلیں مختاریاں اے کاش ہم مجبور ہوجاتے
بھلا تھا تم قریب آنے سے پہلے دُور ہوجاتے
خیالِ ہمنشیں تُو نے نگوں ساری عطا کردی،
جمالِ ہمنشیں پاتے تو ہم مغرُور ہوجاتے
شریکِ ہر نفس یک آرزوئے مرگ ہے ورنہ
مرے سارے چراغ اے زندگی بے نُور ہوجاتے
وصال اِک عیشِ غم تھا دُوری قُربت نُما کیا تھی
یہ ایسے زخم تھے جو بھر کے بھی ناسُور ہوجاتے
سرِ دریائے بے تابی وہ منظر یاد ہے اب تک
کہ ساحل تک سفینے آتے آتے دُور ہوجاتے
تری شانِ عطا کی خیر سائل کی صدا سُنتا
کہ یوُں بھی کاسہ ہائے چشم تھے معمور ہوجاتے

☆☆

O

احساں ترا مجھ پر دلِ ناکام بہت ہے
اِک گوشۂ تنہائی ہے آرام بہت ہے
اس طرح نہ تڑپا مجھے اے رخصتِ خورشید
یادوں کے لئے سلسلۂ شام بہت ہے
حد ہے تری آواز سُنائی نہیں دیتی!
شاید کہ مری رُوح میں کُہرام بہت ہے
میں توڑتا جاتا ہوں عقیدوں کے حصار آج
تم ساتھ رہو ظلمتِ اَوہام بہت ہے
گیسُو سے سرِ ناخنِ پا تک کی حکایت
کیوں چھیڑیئے، رونے کو فقط نام بہت ہے
ہر سنگ ہے مسجُودِ نظر شاذؔ کے حق میں
دل خُوں شدۂ حسرتِ اصنام بہت ہے

☆☆

O

مَیں کہ آماجگہِ حُسن رہا تھا کچھ دِن
آنکھیں کھوئی ہیں تو دیکھا ہے تماشا کچھ دِن

اب کہیں جا کے ذرا آنکھ لگی ہے شائد
دلِ معصوم بہت ٹُوٹ کے رویا کچھ دِن

خُوب رولوں گا، تڑپ لوں گا پلٹ آؤں گا
شہر سے دُور نِکل جاؤں گا تنہا کچھ دِن

لاکھڑا کرتا تھا ہر روز دوراہے پہ مجھے
کیا رُلاتا تھا ترے مِلنے کا وعدہ کچھ دِن

کیسا یاد آتا تھا اِک ایک تیرا خطِ بدَن
کیسا پھرتا تھا نگاہوں میں سَراپا کچھ دِن

کوئی جینے کا تصوّر ہی نہ تھا تیرے بغیر
میں نے مَرنے کے تعلق سے بھی سوچا کچھ دِن

دیکھتے دیکھتے برسوں کی رفاقت چھُوٹی
یُوں بھلا بیٹھے ہم ساتھ تھے گویا کچھ دِن

ٹُوٹ کر بھی مِری اُمید نہ ٹُوٹی تھی ابھی!
تیرے چھُٹنے کا یقیں تک بھی نہ آیا کچھ دِن

یُوں نہ اوجھل ہو نگاہوں سے کہ گھبرا جاؤں
میرے نزدیک نہ آ دُور سے ترسا کچھ دِن

تُو نے مارے مجھے اے ذوقِ شتابی ورنہ
میں نہ مرتا ابھی اے عہدِ تمنّا کچھ دِن

فقط اِک سلسلۂ وہم و گماں ہے یارب
تیری دُنیا کو بہت غور سے دیکھا کچھ دِن

ان دِنوں شاذ کا عالم نہیں دیکھا تُو نے
ایک دھوکا سہی دے اُس کو دلاسہ کچھ دِن

☆☆

O

خود کو ناکردہ گناہوں کی سزا دیں کیوں کر
بس یہی ضد کہ جوانی کو گنوا دیں کیوں کر

اب تری یاد بھی آتی ہے احساں کی طرح
یا کبھی سوچتے رہتے تھے بھلا دیں کیوں کر

تابکے یہ نفسِ سرد، یہ خاکسترِ جاں
بے در و بام ہے گھر آگ لگا دیں کیوں کر

دامنِ ضبط چھٹا جاتا ہے اے پردہ نشیں
غمگساروں کو ترا نام بتا دیں کیوں کر

اتنا مجبور نہ کر اے غمِ حالات ہمیں
یوں سرِ عام بھلا سر کو جھکا دیں کیوں کر

شوخ تر ہونے لگا رنگِ قبا، نامِ خدا
اب تجھے تیری نگاہوں سے چھپا دیں کیوں کر

دیں تو کس طرح بھلا دادِ جتائے ناخن
شوقِ آرائشِ گیسو کو ہوا دیں کیوں کر

لَو نہ یوُں تیز کرو آ کے سِرہانے ہر رات
رنجِ ہر صبح کہ یہ شمع بُجھادیں کیوں کر

دیکھیں اُن نیند بھری آنکھوں کا عالم اے شاذؔ
اُس کو آواز دیں، کس طرح جگادیں کیوں کر

☆☆

O

نفس نفس ہے ترے غم سے چوُر چوُر اب تک
نہ شام ہے نہ سویرا قریب و دُور اب تک

سنی سنائی پہ مت جا ذرا قریب تو آ
سزا نہ دے کہ محبت ہے بے قصور اب تک

مچل رہی ہے کہیں جوئے شیر اے فرہاد
کلیم سُن تو سہی جل رہا ہے طور اب تک

مرے خدا میں کہاں جاؤں، کس طرف ڈھونڈوں
مجھے پکار رہا ہے کوئی ضرور اب تک

نہ تُو مرا نہ تری ہم نشینیاں میری
بھرم ہے جس کو سمجھتے ہیں سب غرور اب تک

اِدھر وفورِ محبت، اُدھر مُروّت تھی
جو کچھ کہا تھا، بھلا دے ترے حضور اب تک

چلا گیا ہے مکیں چھوڑ کر مکاں اپنا!
کوئی نہیں ہے مگر چھن رہا ہے نُور اب تک

وہ ایک حادثہ رُوح و دل کہ بیت گیا
جسے نہ مان سکا شؔاذ کا شعور اب تک

☆☆

O

ہم شائد کچھ ڈھونڈ رہے تھے' یاد آیا تو روتے ہیں'
تازہ تازہ اس کو کھوکر جانے کیا کیا کھوتے ہیں'
ایک طرف یہ دُنیاداری ایک طرف وہ خلوتِ غم
دُنیاوالو ہر محفل میں دیکھو ہم بھی ہوتے ہیں'
پہلی کرن کا دھڑکا کیا کیا دِل کو مسکتا جائے ہے
بھور بھئے جب کنج میں غنچے مُنہ شبنم سے دھوتے ہیں'
تجھ کو ترے گُل پھول مبارک یاں ضِد ٹھہری جینے سے
ہم تو اپنی راہ میں پیارے چُن چُن کانٹے بوتے ہیں'
تیرے دُکھ سُکھ تو ہی جانے' ہم نے بس اِتنا جانا ہے
تجھ سے پہلے جاگ اُٹھتے ہیں تیرے بعد ہی سوتے ہیں'
سیج کو سونا کر گئے خوباں' شِکن شِکن فریاد کرے
پہلو' پہلو' چونک اُٹھے ہم کروٹ کروٹ روتے ہیں
اُس نے باغ سے جاتے جاتے موسمِ گُل بھی باندھ لیا
شاذ کو دیکھو دیوانے ہیں' بیٹھے ہار پروتے ہیں'

☆☆

O

کوئی اُمید کی صورت کوئی وعدہ، کوئی آس
دینے والے نے دیا کتنے برس کا بَن باس
دُور تک ڈھونڈتا جاؤں گا ترے نقشِ قدم
دُور تک سلسلۂ دشت تمنّا ہے اُداس
غرقِ دریا کیا اربابِ کرم نے مجھ کو
چشمۂ ریگ رَواں تُو نے جگائی تھی یہ پیاس
زندگی ایک نیستاں کے سوا کچھ بھی نہیں
کون پہنائے مرے شعلۂ عُریاں کو لباس
اُس نے پوچھا بھی نہیں مجھ سے نہ ملنے کا سبب
جس نے ملنے ہی پہ رکھی تھی محبت کی اَساس
گرہِ دل ہے، کُھلی ہے تو رسن کی صورت
اے گلو رشکِ یقیں تھا مرے ناخن کا قیاس
شاذ بڑھ جائے نہ شائستگیٔ کام و دہن
ڈر رہا ہوں کہ کہیں زہر ہی آجائے نہ راس

☆☆

O

جفا آسودہ و فرقت شناسا کردیا تُو نے
خبر بھی ہے تجھے اے بے خبر کیا کردیا تُو نے

شروعِ عشق کے قصے بُھلا بیٹھے تھے ہم دل سے
مآلِ عشق پر ان سب کو تازہ کردیا تُو نے

تری اُمید پر کیا کیا ادھورے کام چھوڑے تھے
ہجومِ دفترِ حسرت میں تنہا کردیا تُو نے

وہ کیا ریلا تھا کیونکر ہاتھ چھوٹے کس کو سمجھاؤں
بھرے میلے میں دُنیا کے اکیلا کردیا تُو نے

مری کھوئی ہوئی باتیں ترے غم کی مُناجاتیں
مرے پندار کو عجزِ سراپا کردیا تُو نے

مری آواز آئی یا تری زنجیرِ در گُونجی
مری خاموشیوں کو بھی تقاضا کردیا تُو نے

مرے اشعار کو خاموشی و سنجیدگی دے دی
مرے نغموں کو پچھلے کا دُھندلکا کردیا تُو نے

کہاں جاؤں مجھے پہچاننے والا نہیں کوئی
ہر آئینہ کے آگے جیسے رُسوا کردیا تُو نے

میں تیرے واسطے دُنیا کو ٹھکراتا رہا برسوں
جسے ٹھکرا دیا تھا کیوں اُسی کا کردیا تُو نے

پرائے آج اپنے ہوگئے تیری نگاہوں میں
مجھے اپنا سمجھ کر کیوں پرایا کردیا تُو نے

چُراتا پھر رہا ہوں اپنی آنکھیں غمگساروں سے
کچھ ایسا لگ رہا ہے مجھ کو جھوٹا کردیا تُو نے

لکیر اِک کھینچ دی میں نے مقدّر کے نوشتے پر
جلی حرفِ محبت کو شکستہ کر دیا تُو نے

سحر کا خوف، دن کا وسوسہ، شب کی گراں جانی
کہ یوں مَر مَر کے جینا میرا حِصّہ کردیا تُو نے

کڑے کوسوں بھی تیری یاد کا دامن نہیں چھوٹا
کہ خوشبوئے وفا کو دشت پیما کردیا تُو نے

خراش اِک چیخ کی جس طرح سنّاٹے کے چہرے پر
کچھ ایسا ہی مِرا حالِ تمنّا کردیا تُو نے

ترا دامن گلستاں ہو کہ مدفن شاذؔ کے حق میں
بہرصورت مجھے اشکِ چکیدہ کردیا تُو نے

O

وہ کون دیر نشیں تھا حرم کے گوشے میں
کسی کی یاد تھی یادِ خدا کے پردے میں

کہیں تو کس سے کہیں چپ سی لگ گئی ہے ہمیں
بڑا سکوں ہے تری بے رُخی کے صدقے میں

دِکھا دِکھا کے جھلک کوئی چھپتا جاتا تھا
کہاں کہاں نہ صدا دی کسی کے دھوکے میں

خبر نہیں کہ تری یاد کیا ترا غم کیا
مگر وہ درد جو ہوتا ہے سانس لینے میں

ترے فراق کی یہ دین بھی قیامت ہے
کہاں کی آگ سمودی ہے میرے نغمے میں

چلی تھی کشتیٔ دل بادبانِ یاد کے ساتھ
کہاں اُتار گئی اجنبی جزیرے میں

وہ آدھی رات' وہ سُنسان راستہ وہ مکاں
وہ اک شمع سی جلتی ہوئی دریچے میں

نشیب وادیٔ غم میں اُتر گیا ہے کوئی
کھڑا ہوا ہے کوئی آج تک جھروکے میں

حیات کیا ہے اَجل کو بھی ہار بیٹھے شاذؔ
کہیں کے بھی نہ رہے نقدِ دل کے سودے میں

☆☆

O

پھر فریبِ آرزو کا حوصلہ پاتے ہیں ہم
اب کسی کو رفتہ رفتہ بھولتے جاتے ہیں ہم

خوفِ گلچیں تک نہیں، مانا خزاں کے پھول ہیں؛
اپنے کھلنے کی سزا پائی کہ مرجھاتے ہیں ہم

روز وحشت کا تقاضا ہے کہ صحرا کو چلیں
روز اپنے آپ کو زنجیر پہناتے ہیں ہم

زندگانی کو فنا آسودگی کے واسطے
تُو نے ترسایا نہ ہوگا جتنا ترساتے ہیں ہم

دشتِ بے آب و گیاہِ زندگی میں چار سُو
ایک دیوارِ ہوا ہے سر کو ٹکراتے ہیں ہم

اب سُنا ہے کوئی خالی ہاتھ پھرتا ہی نہیں
دینے والے تجھ کو شاید یاد آجاتے ہیں ہم

تیری شہ پاکر کوئی تجھ سے گِلہ کرتا رہا
اب گِلہ کرتے ہوئے خود کو سُبک پاتے ہیں ہم

شاذؔ کچھ ہو اِک نہ اِک حرفِ تسلّی چاہیئے
صُحبتِ ناصح سے بھی اب جی کو بہلاتے ہیں ہم

☆☆

O

نیاز و ناز کی راحت رسانی یاد آتی ہے
وہ اپنا حال تیری ترجُمانی یاد آتی ہے

اچانک جیسے اِک دُنیا سے رشتہ ٹُوٹ جاتا ہے
وہ عالم کیا کہوں جب ناگہانی یاد آتی ہے

نہ پُوچھو کس لئے کُوچہ بہ کُوچہ دَر بدَر ہوں مَیں
مجھے گھر میں کسی کی میہمانی یاد آتی ہے

شفق کی سیڑھیوں سے دن چلا ہے شام روتی ہے
یہ منظر دیکھ کر کیوں اِک پُرانی یاد آتی ہے

یہ مہر و ماہ جیسے روشنی کی یادگاریں ہیں
تری چھوڑی ہوئی اِک اِک نشانی یاد آتی ہے

تُو برہم تھا مگر تیری نگاہیں جھُکتی جاتی تھیں
تری تہذیب تیری سَرگرانی یاد آتی ہے

مرے خوابِ تمنا کے سَرہانے کس کی آہٹ تھی
کسی تعبیرِ غم کی پاسبانی یاد آتی ہے

وفا کے مرحلے میں کوئی بدلا ہے نہ بدلے گا
ہنسی آتی ہے اپنی خوش گمانی یاد آتی ہے

خدا شاہد ہے تیرے غم سے جب آنکھیں ملاتا ہوں
مجھے اُس وقت اپنی سخت جانی یاد آتی ہے

مرے نغموں نے پائی شاذؔ شہرت بے وطن ہو کر
مجھے اہلِ وطن کی قدردانی یاد آتی ہے

O

کون دیتا رہا صحرا میں صدا میری طرح
آج تنہا ہوں مگر کوئی تو تھا میری طرح

کوئی مِلتا ہے کسی سے تو لرز اُٹھتا ہوں
کہ وہ ہوجائے نہ رو رو کے جُدا میری طرح

سایہ منّت کشِ قامت بھی نہیں ہے یارب
میں نے دیکھا ہے مگر سب کو دِکھا میری طرح

اُس کی وحشت کا بھلا کس کو یقیں آئے گا
مُدتوں اُس نے بھی دامن نہ سِیا میری طرح

صُبح کا بھُولا سَرِ شام پلٹ آئے گا
آج تک اُس کو بھی یہ وہم ہے کیا میری طرح

مَیں تری راہ میں پامال ہوا جاتا ہوں!
مِٹ نہ جائے ترا نقشِ کفِ پا میری طرح

مَیں ہی تنہا ہوں فقط تیری بھری دُنیا میں
اور بھی لوگ ہیں کیا میرے خُدا میری طرح

کس کو حاصل ہے تری چشمِ حیا کے آگے
منصبِ سلسلۂ جُرم و خطا میری طرح

رنگِ اربابِ رضا پیشہ مُبارک ہو تجھے
کوئی ہوتا ہی نہیں تجھ سے خفا میری طرح

آشنا کون ہے نقشِ قدمِ نکہت کا
یاد کس کو ہے ترے گھر کا پتہ میری طرح

شاذؔ تارا نہیں ٹُوٹا کوئی دِل ٹُوٹا ہے
راہ تکتا تھا شبِ غم کوئی کیا میری طرح

O

دِل شکستہ ہوئے ٹوٹا ہوا پیمان بنے
ہم وہی ہیں جو تمہیں دیکھ کے انجان بنے

چند یادیں مِری زنجیرِ شب و روز بنیں
چند لمحے مِرے کھوئے ہوئے اوسان بنے

وہ بھی کیا فصل تھی کیا شعلۂ خرمن تھا بلند
وہ بھی کیا دِن تھے کہ دامن سے گریبان بنے

اُن کی دُوری کا بھی احساں ہے مِری سانسوں پر
مجھ سے اِس طرح وہ بچھڑے کہ نِگہ بان بنے

اہلِ ساحل سے ندامت سی ندامت ہے کہ ہم
ایک کشتئ تہِ آب کا سامان بنے

ہائے کیا آس تھی کیا کیا نہ تمہیں بننا تھا
تم بنے بھی تو مِرے درد کی پہچان بنے

گھر سجانا تو کُجا شاذ لُٹا بھی نہ سکوں
اُن سے شِکوہ ہے کہ وہ کیوں مِرے مہمان بنے

☆☆

O

اِک جنسِ وفا پر ہیں سُبکسار سے اب تک
کیا کیا نہ تقاضے ہیں خریدار سے اب تک
سُنسان جزیروں کا پتہ دیتی ہے مجھ کو
چھنتی ہوئی کچھ چاندنی اشجار سے اب تک
جیسے مِری سانسوں میں ہے سَنّاٹے کی پھنکار
اندازہ نہیں ہوتا ہے گفتار سے اب تک
نغمے سے تری یاد کا رشتہ نہیں ٹوٹا
دِل ڈُوبتا ہے ساز کی جھنکار سے اب تک
احسانِ مصوّر ہے مِرے دیدۂ نم پر
تصویر تری تکتی ہے کس پیار سے اب تک
کب سے تجھے روتا ہوں طبیعت نہیں ٹھہری
اُترا نہیں تُو دَرد کے معیار سے اب تک
اشعار جنھیں مجھ سے کہلوائے تھے اُس نے
شاذ آنکھ چُراتا ہے ہوں اُن اشعار سے اب تک

☆☆

O

نگہِ تصوّرِ عشق اب تری حیرتیں بھی نہیں رہیں
کسی آئینے سے گلہ نہیں کہ وہ صورتیں بھی نہیں رہیں

مرے دل کو بھی کبھی خوف تھا کہیں راہ میں نہ ہو سامنا
مگر آج کوئی مِلا تو کیا وہ ندامتیں بھی نہیں رہیں

یہ ستم یہ جور یہ روز و شب، مجھے ہو چلے ہیں قبول سب
ترے بعد شیشۂ دل کی اب وہ نزاکتیں بھی نہیں رہیں

کہیں تجھ سے اپنی، تری سُنیں، کبھی آپ اپنے پہ بھی ہنسیں،
کہیں بیٹھ کر کبھی رو بھی لیں، یہ فراغتیں بھی نہیں رہیں

کوئی مَر کے جی اُٹھا بارہا، کبھی جیتے جی ہی گذر گیا
مگر اب نہ جانے یہ کیا ہوا کہ یہ عادتیں بھی نہیں رہیں

کوئی پھر سے شہر میں آبسا نہیں مجھ میں دید کا حوصلہ
مری بے بسی کوئی دیکھتا کہ مسافتیں بھی نہیں رہیں

ہو یقیں تو کوئی کرے بیاں سُنے کون شاذ یہ داستاں،
ہمیں جن پہ جھوٹ کا تھا گُماں وہ صداقتیں بھی نہیں رہیں،

☆☆

O

بڑے خلوص سے دامن پَسارتا ہے کوئی
خدا کو جیسے زمیں پر اُتارتا ہے کوئی

نہ پوُچھ کیا ترے ملنے کی آس ہوتی ہے
کہاں گذُرتی ہے کیسے گذارتا ہے کوئی

بجاہے شرطِ وفا شرطِ زندگی بھی تو ہو
بچاسکے تو بچالے کہ ہارتا ہے کوئی

وہ کون شخص ہے کیا نام ہے خدا جانے
اندھری رات ہے کس کو پکارتا ہے کوئی

تمام عشق کی جاگیر ہوگئی دُنیا
تری نگاہ پہ دُنیا کو وارتا ہے کوئی

چراغ رکھ کے سرِ شام دل کے زینے پر
مجھے خبر نہیں ہوتی سِدھارتا ہے کوئی

یہ سَر کا بوجھ نہیں، دل کا بوجھ ہے اے شاذؔ!
کہاں اُترتا ہے لیکن، اُتارتا ہے کوئی

☆☆

O

وفا کی رسم اُٹھا دیتے، عمارت دل کی ڈھا دیتے
نہ ملتے تم تو ہم اِس شہر کو صحرا بنا دیتے
خطا کو خواہشِ بارِ دگر کا حوصلہ دیتے
قیامت ہے تمہارا بخش دینا کچھ سزا دیتے
تمہارے پاس تھی تحریرِ بختِ نارسا اپنی
تمہارے بس میں تھا ترمیم کرتے یا مِٹا دیتے
گدائے آخرِ شب تھے تہی کاسہ پھرے برسوں
کوئی مِلتا تو ہم اہلِ کرم کا واسطہ دیتے
تُو آیا ہی نہیں اِس خانۂ تیرہ سے گھبرا کر
ہماری سادہ لوحی پر یقیں کر، گھر جَلا دیتے
مزاجِ اسکندری، قسمت ایازی لے کے آئے تھے
کہاں ممکن تھا دستِ سنگ میں ہم آئینہ دیتے

☆☆

O

مرے نصیب نے جب مجھ سے انتقام لیا
کہاں کہاں تری یادوں نے ہاتھ تھام لیا
فضا کی آنکھ بھر آئی ہوا کا رنگ اُڑا
سکوتِ شام نے چپکے سے تیرا نام لیا
وہ میں نہیں تھا کہ اِک حرف بھی نہ کہہ پایا
وہ بے بسی تھی کہ جس نے ترا سلام لیا
ہر اِک خوشی نے ترے غم کی آبرو رکھ لی
ہر اِک خوشی سے ترے غم نے انتقام لیا
وہ معرکہ تھا کہ فتح و شکست بھی نہ مِلی
نہ جانے شاذؔ نے کس مصلحت سے کام لیا

☆☆

○

بنا حُسنِ تکلّم، حُسنِ ظن آہستہ آہستہ
بہر صورت کھُلا اِک کم سخن آہستہ آہستہ

مسافر راہ میں ہے شام گہری ہوتی جاتی ہے
سُلگتا ہے تری یادوں کا بَن آہستہ آہستہ

دُھواں دل سے اُٹھے چہرے تک آئے نُور ہو جائے
بڑی مشکل سے آتا ہے یہ فن آہستہ آہستہ

ق

ابھی تو سنگِ طفلاں کا ہدف بنتا ہے کُوچوں میں
کہ راس آتا ہے یہ دیوانہ پَن آہستہ آہستہ

ابھی تو امتحانِ آبلہ پا ہے بیاباں میں
بنیں گے گنجِ گُل دشت و دمن آہستہ آہستہ

ابھی کیوں کر کہوں زیرِ نقابِ سرمگیں کیا ہے
بدلتا ہے زمانے کا چلن آہستہ آہستہ

میں اہلِ انجمن کی خلوتِ دل کا مغنّی ہُوں
مجھے پہچان لے گی انجمن آہستہ آہستہ

دلِ ہر سنگ گویا شمعِ محراب تمنّا ہے
اثر کرتی ہے ضربِ کوہکن آہستہ آہستہ

کسی کافر کی شوخی نے کہلوائی غزل مجھ سے
کھلے گا شاذ اب رنگِ سخن آہستہ آہستہ

☆☆

○

تری نظر سببِ تشنگی نہ بن جائے
کہیں شراب مری زندگی نہ بن جائے

کبھی کبھی تو اندھیرا بھی خوبصورت ہے
ترا خیال کہیں روشنی نہ بن جائے

بھڑک نہ جائے کہیں شمعِ علم و دانش بھی،
جنوں جنوں ہی رہے، آگہی نہ بن جائے

میں ڈر رہا ہوں کہاں تیرا سامنا ہوگا
ترا وجود ہی میری کمی نہ بن جائے

ترے بغیر زمانے کو منہ دِکھا نہ سکوں
یہ زندگی کہیں شرمندگی نہ بن جائے

جہاں میں ہے کہ کمیں گاہ میں خدا جانے
اب اِس قدر بھی سُبک آدمی نہ بن جائے

یہ وہم دِل کو سَتاتا ہے رُوبرو تیرے
یہ تری دید کہیں آخری نہ بن جائے

طرب کی بزم میں کم کم فسردگی اے شاذؔ
کہیں مزاج کی اُفتاد ہی نہ بن جائے

☆☆

O

نہ محفل ایسی ہوتی ہے نہ خلوت ایسی ہوتی ہے
مرے معبود کیا جینے کی صورت ایسی ہوتی ہے

بس اِک کیفیتِ خود رفتگی تنہائیاں اپنی
ہمیں ملتی ہے فرصت بھی تو فرصت ایسی ہوتی ہے

یہ دنیا سر بہ سر رنگینیوں میں ڈوب جاتی ہے
تری قامت کی ہر شے میں شباہت ایسی ہوتی ہے

دَر و دیوار پر بس ایک سنّاٹے کی رونق ہے
مرے مہماں سے پوچھو گھر کی جنّت ایسی ہوتی ہے

کہاں اپنی سیہ کاری کہاں یہ تیری معصومی
تجھے دیکھا نہیں جاتا ندامت ایسی ہوتی ہے

کوئی دیکھے تجھے تو ازسرِ نو زندگی مانگے
روایت جھوٹ ہے قاتل کی صورت ایسی ہوتی ہے

یہ مجبوری محبت بھیک جیسی بھی گوارا ہے
کبھی دِن رات کو تیری ضرورت ایسی ہوتی ہے

بچھڑ کر تجھ سے ملنے کی مسرت بھول جاتا ہوں
کہ مِل کر پھر بچھڑنے کی اذیت ایسی ہوتی ہے

اُٹھے اذن و اجازت سے مگر رُکنا پڑا پہروں
کہ شاذ اُس آنکھ کی اذن و اجازت ایسی ہوتی ہے

☆☆

O

کیا کروں رنج گوارا نہ خوشی راس مجھے
جینے دے گی نہ مِری شدّتِ احساس مجھے

اِس طرح بھی تری دُوری میں کٹے ہیں کچھ دن
ہنس پڑا ہُوں تو ہوا جُرم کا احساس مجھے

ہم نے اِک دوسرے کو پُرسۂ فرقت نہ دیا
میری خاطر تھی تجھے اور ترا پاس مجھے

ایک ٹھہرا ہوا دریا ہے مِری آنکھوں میں
کِن سرابوں میں ڈُبوتی ہے تری پیاس مجھے

جیسے پہلُوئے طرب میں کوئی نشتر رکھ دے
آج تک یاد ہے تیری نگہِ یاس مجھے

ریزہ ریزہ ہوا جاتا ہے مرا سنگِ وجود
یُوں صدا دے نہ پسِ پردۂ انفاس مجھے

شاخ سے برگِ چکیدہ کا تقاضا جیسے
کچھ اسی طرح ابھی تک ہے تری آس مجھے

رُوح کے دشت میں اِک ہُو کا سَماں ہے اے شاذؔ
دے گیا کون بھرے شہر میں بَن باس مجھے

☆☆

O

کیا قیامت ہے کہ اِک شخص کا ہو بھی نہ سکوں
زندگی کون سی دولت ہے کہ کھو بھی نہ سکوں

گھر سے نکلوں تو بھرے شہر کے ہنگامے ہیں
میں وہ مجبور تری یاد میں رو بھی نہ سکوں

دن کے پہلو سے لگا رہتا ہے اندیشۂ شام
صبح کے خوف سے نیند آئے تو سو بھی نہ سکوں

ختم ہوتا ہی نہیں سلسلۂ موجِ سَراب
پار اُتر بھی نہ سکوں، ناؤ ڈُبو بھی نہ سکوں

شاذؔ معلوم ہُوا عجز بیانی کیا ہے
دِل میں وہ آگ ہے لفظوں میں سمو بھی نہ سکوں

☆☆

○

زندگی کو اِک دُعائے کار گر سمجھا تھا مَیں
وہ ترا دَر تھا جسے بابِ اثر سمجھا تھا مَیں

میکدہ بھی اب حصارِ خود فراموشی نہیں
نشۂ جام و سُبو کو معتبر سمجھا تھا مَیں

مُدتوں رویا ہُوں قحطِ آستینِ دوست پر
دشت کو شائد رہینِ بام و دَر سمجھا تھا مَیں

چھپ گیا کوئی مگر آنکھوں میں بس کر رہ گیا
حُسنِ یزداں تھا جسے حُسنِ بشر سمجھا تھا مَیں

نیند میں جس طرح تکمیلِ نشاطِ آرزو
حسرتِ تعمیر کو یوُں اپنا گھر سمجھا تھا مَیں

اِک نگاہِ واپسیں کچھ دُور آکر رَہ گئی
اُس کو بھی منجملۂ رختِ سفر سمجھا تھا مَیں

وقت نے سمجھا دیا مفہُومِ حرفِ آرزو
کس کو سمجھاؤں بہ اندازِ دگر سمجھا تھا مَیں

سلسلہ تارِ نفس کا جانے کب ٹوُٹے گا شاذؔ
اُس سے چھٹ کر زندگی کو مختصر سمجھا تھا مَیں

☆☆

O

پھر وہی نکہتِ بادِ سحری کیسی ہے
دِل دُکھا جاتا ہے یہ خوش خبری کیسی ہے
جانے والے سے یہ پوچھو کہ وہ کیا چھوڑ گیا
کچھ امانت سی مرے دل میں دھری کیسی ہے
کیا قیامت ہے تیرے غم کی نگہداری بھی
لوگ کیا جانیں مری خود نگری کیسی ہے
اِک بیاباں کوئی قدموں میں بچھا جاتا ہے
ہم سفر کوئی نہیں ہمسفری کیسی ہے
سوزنِ اشک سے سِیتا ہوں گریبانِ نشاط
یہ جنوں کیسا ہے یہ بخیہ گری کیسی ہے
کیا یہ دُنیا مرے ہاتھوں سے نکل جائے گی
دستِ کوتاہ تری بے خبری کیسی ہے

آس رہزن کی طرح میرے تعاقب میں ہے شاذؔ
کیا خبر اُس کو یہ بے بال و پَری کیسی ہے!

☆☆

O

نہ رونا تھا نہ ہنسنا پھر بھی نم دیدہ رہے برسوں
ترے غم کا تقاضا تھا کہ سنجیدہ رہے برسوں

طلسمِ خوابِ رنگیں دوسری کروٹ بدلنا تھا
یہ کیا ہم ایک ہی پہلُو سے خوابیدہ رہے برسوں

اُسے فرصت کہاں دی عشق نے گیسُو بنانے کی
پریشاں حالیوں پر اُس کی گردیدہ رہے برسوں

ہماری آرزو کیا تھی سکوتِ سنگ تھا گویا
ہزاروں حرفِ سادہ ناتراشیدہ رہے برسوں

ہمیں کیا ہوگیا تھا روز و شب سے کھنچ کے ملتے تھے
کہیں کیا شاذ اب کس کس سے رنجیدہ رہے برسوں

☆☆

O

وہ وقت ہے مجھ پر جو کسی پر نہیں آیا
اللہ کہاں ہے وہ پلٹ کر نہیں آیا
چُپ چاپ کھڑا تھا درِ مجبوری پہ کوئی
تو پردۂ مجبوری سے باہر نہیں آیا
دُنیا نے مجھے پُشت سے دیکھا تو گلہ کیا
میں آئینہ تھا میرا سکندر نہیں آیا
اپنے سے شکایت تھی زمانے سے گلہ تھا
جینے کا سلیقہ مجھے اکثر نہیں آیا
تعبیر تھی ہر بار مرے سامنے آئی
اِک خواب تھا آنکھوں میں مکرّر نہیں آیا
کیا منظرِ رخصت کا دُھواں ہے کہ ابھی تک
آنکھوں میں کوئی دوسرا منظر نہیں آیا
اے چشمۂ خورشیدِ تمنا ترے صدقے
کیوں شام ڈھلے شاذؔ ابھی گھر نہیں آیا

☆☆

O

کسی کا درد امانت ہے میرے سینے میں
کہ جیسے وُسعتِ دریا ملے سفینے میں
خبر نہیں کہ مِرے شعر کیا مِرا فن کیا
اِک آگ ہے کہ جو ڈھلتی ہے آبگینے میں
برس تمام ہوا اور عمر باقی ہے
جُدا ہوئے تھے وہ مجھ سے اِسی مہینے میں
مجھے یہ ڈر کہ تری یاد ہچکیاں نہ بنے
کچھ اور عذر نہیں ہے شراب پینے میں
ترے خیال سے رگ رگ دُکھی ہوئی ہے مری
عجب طرح کی کمی رہ گئی ہے جینے میں
مِرا یہ حال ترا ذکر سُن کے یوں چپ ہوں
شعاع دفن ہو جیسے کسی نگینے میں
تمام غم ہوں مجھے شاذؔ سہل مت جانو
گئی اِک عُمر مری ضبط کے قرینے میں

☆☆

O

عُمر بھر حسرتِ تعمیرِ نشیمن میں رہوں
میں جہاں جاؤں ترے درد کی الجھن میں رہوں

میں تو آنسو ہوں، مرے بخت کا کیا کہنا ہے
تیری آنکھوں میں رہوں یا ترے دامن میں رہوں

کیا ہوئی تیری دُعائے سحر و شام کہ مَیں
روزِ روشن کی طرح زُلفِ شب افگن میں رہوں

تُو خدا ہے مرے حق میں تو مجھے آس بہت
میں اسی آگ اِسی وادیٔ ایمن میں رہوں

سر بہ سجدہ ہی کٹے زیرِ کمانِ اَبرو
ڈور کی طرح تری سانس کی سُمرن میں رہوں

تیز ہے بادِ مخالف مرے گلشن سے نہ جا
کہ اگر شاخ سے ٹوٹوں ترے دامن میں رہوں

دل تو سینہ میں وہی ہے تری یادوں کا حَرم
میں بیاباں میں رہوں شاذ کہ مدفن میں رہوں

☆☆

○

تُو نے مجھے غم بخشا کیا فکرِ طرب کوشی،
کس دل سے کرے کوئی احسان فراموشی،

نیندوں کے شبستاں میں کچھ خواب تھے آسودہ
خوابوں کے سرہانے تھی شمعوں کی سیہ پوشی،

ہم شہرِ تمنّا کے دروازہ سے لَوٹ آئے
اللہ رے سنّاٹا، اللہ ری خاموشی،

وہ کیا مری خواہش تھی، سب تیری نوازش تھی،
تقدیر کی سازش تھی، اُمید کی سرگوشی،

وہ تو تری صوُرت تھی، ہر ایک سے قربت تھی،
اب دیکھئے ہوتی ہے کس کس سے سُبکدوشی،

ہیں کس کا مقدّر ہم، رہزن ہیں کہ رہبر ہم
رُک جائیں تو پتھّر ہم، اے دشتِ فراموشی

محفِل میں چھپا دینا، ہر شمع بُجھا دینا
اے راحتِ گُمنامی، اے خواہشِ رُوپوشی،

ہر جامِ سَم آگیں پر رُک جاتی ہے سانس، اکثر
تنہائی کامئے خانہ اور اپنی بَلا نوشی،

ہستی کی یہ موج اپنی، ہے شآذ بھنور، ورنہ
ہر موج کی قسمت ہے ساحل سے ہم آغوشی،

☆☆

O

دلِ برباد کی رُوداد سُنائے نہ بنے
دَرو خوشبُو ہے چھپائیں تو چھپائے نہ بنے

زندگی ضبط کی تاکید ہوئی جاتی ہے
گھر وہ صحرا ہے جہاں خاک اُڑائے نہ بنے

وہ اُجالے مِری صُبحوں کے اُجالے نہ ہوئے
تیری جُھکتی ہوئی پلکوں کے جو سائے نہ بنے

عمر گذُری ہے مگر اب بھی یہ مجبوری ہے
یاد آئیں تو اُنھیں دِل سے بُھلائے نہ بنے

اک تعمیر ادھوری ہے ادھوری ہی سہی
تُو نے کیا قصر بنایا ہے کہ ڈھائے نہ بنے

آرزُو کا شجرِ سایہ فگن ہے سَرسبز
مگر اِک شاخ جُھکائیں تو جُھکائے نہ بنے

نہ ہوئے شاذؔ کسی طرح وہ میرے نہ ہوئے
مُدّتیں گذریں مگر اب بھی پرائے نہ بنے

☆☆

O

دیکھو تو اُدھر جاتے ہیں، معلوم نہیں کیوں،
دیوانے ہیں گھر جاتے ہیں، معلوم نہیں کیوں،

کچھ لوگ جنھیں بھُول کے ہم خوش نہیں ہوتے
کچھ زخم ہیں بھر جاتے ہیں، معلوم نہیں کیوں،

کچھ رات گئے ہوتی ہے آہٹ درِ دل پر،
کچھ پھُول بکھر جاتے ہیں، معلوم نہیں کیوں،

کیوں آ کے ٹھہرتے ہیں یہاں بتکدہ والے
روتے ہیں، گذُر جاتے ہیں، معلوم نہیں کیوں،

مَت پوُچھ نقابوں سے تو یاری ہے ہماری،
ہم چہروں سے ڈر جاتے ہے، معلوم نہیں کیوں،

ہر صُبح تجھے جی سے بھُلانے کا ہے وعدہ
ہر شام مُکر جاتے ہیں، معلوم نہیں کیوں،

جو بانٹتے پھرتے ہیں حیاتِ ابدی شاذؔ
وہ لوگ بھی مَر جاتے ہیں، معلوم نہیں کیوں،

☆☆

O

چھوڑ دوں شہر ترا، چھوڑ دوں دُنیا تیری،
مجھ کو معلوم نہ تھا، کیا ہے تمنّا تیری،

میں اندھیرے میں نہیں، دِن کے اُجالے میں لُٹا
اب کسے ڈھونڈے ہے شمعِ رُخِ زیبا تیری،

جب کوئی پاسِ مُروّت سے کرم کرتا ہے
یاد آتی ہے بہت رنجشِ بے جا تیری،

پَے بہ پَے ساتھ چھٹا جاتا ہے اِک دُنیا کا
دَم بہ دَم یاد چلی آتی ہے گویا تیری،

دامن و دستِ رسَا، بات خدا ساز تو ہے
نارسَائی بھی مشیّت ہے خُدایا تیری،

مُنہدم ہو گئی دیوارِ دلِ دیوانہ
میری قِسمت میں تھی تصویرِ شکستہ تیری،

تار تارِ نفسِ جاں میں ترا نغمہ ہے
پیرہن میں ہے ابھی بُوئے شناسا تیری،

غزلِ شاؔذ ہے صدقہ تری رعنائی کا
رگِ ہر شعر میں ہے موجِ سَراپا تیری،

☆☆

O

یہی سفر کی تمنا، یہی تھکن کی پکار
کھڑے ہوئے ہیں بہت دُور تک گھنے اشجار

زفرق تا بقدم رُوپ رنگ کی جھنکار
تمام مہر و محبت تمام بوس و کنار

نہیں یہ فکر کہ سَر پھوڑنے کہاں جائیں،
بہت بلند ہے اپنے وجود کی دیوار

دراز قد بہ ادائے خرام کیا کہنا
تمام اہلِ جہاں کے لئے ہے درسِ وقار

بدلتی رُت ہے رگِ سبزہ میں نمو کم کم
کلی کلی پہ ترا نام لکھ رہی ہے بہار

شکستہ بُت ہیں جبیں زخم زخم بُت گر کی
سَرہانے تیشہ کے لرزیدہ ہے کوئی جھنکار

دکھائی دے تو وہ بس خواب میں دکھائی دے
مرا یہ حال کہ میں مُدّتوں سے ہُوں بیدار

وہ لوگ جو تجھے ہر روز دیکھتے ہوں گے
اُنھیں خبر نہیں کیا شَے ہے حسرتِ دیدار

یہ دَور وہ ہے کہ سب نیم جاں نظر آئے
کہ رقص میں ہے اناڑی کے ہاتھ میں تلوار

طرح طرح سے کوئی نامِ شاؔذ لکھتا تھا
ہتھیلیوں پہ حِنائی حروف تھے گُل کار

☆☆

O

شب و روز جیسے ٹھہر گئے کوئی ناز ہے نہ نیاز ہے
ترے ہجر میں یہ پتہ چلا مری عمر کتنی دراز ہے
یہ جہاں ہے حبسِ بے اماں، کوئی سانس لے تو بھلا کہاں
ترا حُسن آ گیا درمیاں، یہی زندگی کا جواز ہے
ہو بدن کے لوچ کا کیا بیاں، کسی لَے کی موج ہے پرفشاں
کوئی لَے ہے زیرِ قبا نہاں، کوئی شئے بصورتِ راز ہے
ترے غم سے دل پھر امیر ہو، کوئی چاند نکلے سفیر ہو
شبِ دشت ہُو ہے یہ زندگی نہ نشیب ہے نہ فراز ہے
چلے طائر اُڑ کے پسِ شفق ہے اُداس اُداس رُخِ اُفق
کہ بیاضِ شام کا ہر ورق تری داستانِ دراز ہے
اگر احتیاطِ خطاب ہو، لبِ سنگ کِھل کے گلاب ہو
تو کسی صنم کو صدا تو دے، درِ بُت کدہ ابھی باز ہے
وہی رُوپ ساغرِ جم میں بھی، وہی عکس دیدۂ نم میں بھی،
مرے واسطے تو حرم میں بھی وہی شاذ رُوئے مجاز ہے

O

کھلے تو کیسے کھلے زادِ راہِ بے وطنی
مجھے خبر نہیں کس پیڑ کی ہے چھاؤں گھنی

رواں ہے چاند سُبک بادلوں میں یوں جیسے
کہیں کہیں سے مَسک جائے تنگ پَیرہنی

مچی ہوئی ہے تری دُھوم آسمانوں میں
مگر زمیں ہے ابھی تک مقامِ سُوئے ظنی

کدھر جھکے گی یہ میزانِ گفتگو تیری
مجھے پناہ دے اے وقفہ ہائے کم سُخنی

یونہی اُٹھائے کسی سے اُٹھا ہے پردۂ سنگ
کہ سیکھتا ہے صنم ساز پہلے خود شِکنی

ہمارے ساتھ تو حالات نے مذاق کیا
ہمیں تو شہر میں سونپی گئی ہے کوہ کنی

سلونی سانولی چھب تھی کہ مَر مِٹا تھا شاذ
وہ بول چال گھریلو وہ لہجۂ دکھنی

☆☆

O

ہوا کے دوش پہ رقصِ سحاب جیسا تھا
ترا وجود حقیقت میں خواب جیسا تھا

دمِ وداع سمندر بچھا رہا تھا کوئی
تمام شہر ہی چشمِ پُر آب جیسا تھا

مری نگاہ میں رنگوں کی دھوپ چھاؤں سی تھی
ہجومِ گُل میں وہ کیا تھا گلاب جیسا تھا

ہماری پیاس نے وہ بھی نظارہ دیکھ لیا
رَواں دَواں کوئی دریا سَراب جیسا تھا

جھکی نگاہ، وہ کم کم سخن، دمِ اقرار
وہ حرف حرف ترا اِنتخاب جیسا تھا

مجھے تو سَیرِ جہاں، سَیرِ بازگشت ہوئی
ترا جہان دلِ خانہ خراب جیسا تھا

شکستہ خوابوں کے ٹکڑوں کو جوڑتے تھے ہم
وہ دِن عجیب تھا روزِ حِساب جیسا تھا

ہمیں برتنے میں کچھ احتیاط لازم تھی
دِلوں کا حال شکستہ کتاب جیسا تھا

میں شاذؔ کیا کہوں کیا روشنی تھی راہوں میں
وہ آفتاب نہ تھا آفتاب جیسا تھا

☆☆

O

ستاروں کو شب غم آبدیدہ چھوڑ آئے ہیں
ہم اپنا ذکر دانستہ ادھورا چھوڑ آئے ہیں

وہ پھولوں میں گھرا نیلا دریچہ نیم واکیوں تھا
کن افسردہ نگاہوں کا تقاضا چھوڑ آئے ہیں

دروں بینیٔ چشم معتبر کی آزمائش ہے
رُخِ مضمون پہ ہم لفظوں کا پردہ چھوڑ آئے ہیں

کچھ اُن سے پوُچھیے کیا چیز ہے محفل کا سناٹا
جو اپنی خلوتوں کا عیشِ تنہا چھوڑ آئے ہیں

نہ روکو اے وطن والوں کہ دم بھر کو چلے آئے
ہم اپنی شامِ غربت کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں

بیاضِ یادِ رفتہ کے ورق گُم کردیئے ہم نے
صنم خانے کو یوُں چہرہ بہ چہرہ چھوڑ آئے ہیں

حسابِ روز و شب میں ایک لمحے کا خسارہ ہے
خدا جانے کہاں وہ ایک لمحہ چھوڑ آئے ہیں

یہی ہیں شاذؔ جو اے کوفۂ پونہ[۱] تری خاطر
صنم آباد تھے جس میں وہ کعبہ چھوڑ آئے ہیں

☆☆

۱۔ پوُنے کے دوران قیام میں کہی گئی

O

کوئی تنہائی کا احساس دلاتا ہے مجھے
میں بہت دُور ہوں نزدیک بلاتا ہے مجھے

مَیں نے محسوس کیا شہر کے ہنگامے میں
کوئی صحرا میں ہے، صحرا میں بُلاتا ہے مجھے

تُو کہاں ہے کہ تری زُلف کا سایہ سایہ
ہر گھنی چھاؤں میں لے جا کے بٹھاتا ہے مجھے

اے مِرے حالِ پریشاں کے نگہدار یہ کیا
کِس قدر دُور سے آئینہ دکھاتا ہے مجھے

اے مکینِ دل و جاں، میں ترا سنّاٹا ہوں
مَیں عمارت ہوں تری کس لئے ڈھاتا ہے مجھے

رحم کر، میں تری مژگاں پہ ہوں آنسو کی طرح
کس قیامت کی بلندی سے گراتا ہے مجھے

شاذؔ اب کون سی تحریر کو تقدیر کہوں
کوئی لکھتا ہے مجھے کوئی مٹاتا ہے مجھے

☆☆

O

تیرے ہمراہ یقیں کیا ہے، تو ہم بھی گیا
میرے آنسو بھی گئے میرا تبسم بھی گیا

پہلے غم میں بھی تھا اِک شائبہ رنگِ نشاط
اب تو فریاد سے احساسِ ترنّم بھی گیا

میری آنکھوں میں تلاطم نہ سہی پندگرو
ہائے کیا کانوں سے وہ شورِ تلاطم بھی گیا

پیچ و خَم کچھ بھی نہیں جادۂ نومیدی میں
شادی و رنج کا اب خوفِ تصادُم بھی گیا

ہمیں برباد ہوئے ایک زمانہ گذرا
اب تو دُنیا کی نگاہوں سے ترحّم بھی گیا

ہم سفر پُوچھ رہے ہیں مِرے لُٹنے کا سَبب
اُن سے کیا کہتا کہ سَامانِ تکلّم بھی گیا

میکدہ کے در و دیوار سے مِل کر رُوئیں،
شاؔذ ساقی بھی گیا، مے بھی گئی، خُم بھی گیا

☆☆

O

خوابِ تیشہ کسی اعجاز میں کس طرح ڈھلے
دستِ فرہاد دھرا ہے ابھی پتھر کے تلے

روک لے کوئی کہ آگے تو اندھیرا ہے بہت
طائرِ دشت پسِ شام کہاں لوٹ چلے

نقش وہ ہے کہ لکیروں سے شعائیں پھوٹیں
عکس وہ ہے کہ جو آئینہ در آئینہ چلے

پھر کوئی آئے جسے ٹوٹ کے چاہا جائے
ہمیں اک عمر ہوئی ہے کفِ افسوس ملے

کون راحت ہمیں ملتی تھی وطن میں پھر بھی
لوگ بھولے نہیں جاتے وہ بُرے ہوں کہ بھلے

ہم ہوئے زیست ہوئی' دونوں برابر کے حریف
معرکے ٹھہرے مگر تیرے تبسم سے ٹلے

ہائے وہ روشنیٔ طبع کے مارے ہوئے لوگ
کس تکلف سے زمانے ترے ہمراہ چلے

مہر جب تک نہ ہتھیلی سے اُگایا جائے
کارِ امروز چلے اور چلے اور چلے

شاذؔ تنہائی کے صحرا کا سفر ہے درپیش
در و دیوار جو ہوتے تو لگا لیتے گلے

☆☆

O

پیاسا ہوں ریگ زار میں دریا دکھائی دے
جو حال پُوچھ لے وہ مسیحا دکھائی دے
ہر تازہ وارِدِ خمِ گیسو کو دیکھ کر
مجھ کو پھر اپنا عہدِ تمنا دکھائی دے
قُربت کی آنچ آئی کہ جلنے لگا بَدن
دُوری کا درد آج چمکتا دکھائی دے
لہجے کے لوچ میں ہے گناہوں کی دلکشی
آنکھوں میں معبدوں کا سویرا دکھائی دے
چُبھتے ہوئے لباس کا چھنتا ہوا جمال
بُت گر نقابِ سنگ اُلٹتا دکھائی دے
پڑتی ہے سات رنگوں کی تیرے بدن پہ چھوٹ
جو رنگ تُو پہن لے وہ گہرا دکھائی دے
خلوت کی انجمن ہے وفاؤں کا سلسلہ
کیا ذکرِ عشق حسن بھی تنہا دکھائی دے
کیا کیا حقیقتوں پہ ہیں پردے پڑے ہوئے
تُو ہے کسی کا اور کسی کا دکھائی دے
اس آس نے تو اپنا سفینہ ڈُبو دیا
طوفاں تھمے تو کوئی جزیرہ دکھائی دے

ہر شخص آپ اپنے تعاقب میں ہے رواں
عالم تمام ایک تماشہ دکھائی دے

دریا پہ آنسوؤں کے تجھے ڈھونڈھتا ہوں مَیں
پانی پہ تیرا نقشِ کفِ پا دکھائی دے

آؤ کہ دیکھ آئیں فراموشیوں کا شہر
ممکن ہے کوئی اپنا پرایا دکھائی دے

مخدوم و جامی آہ کہاں کھو کے رہ گئے
ارضِ دکن میں شاذ اکیلا دکھائی دے

☆☆

O

فسانے لوگ بہت دِل پذیر کہتے ہیں
وہ جُوئے خُوں تھی جسے جوئے شیر کہتے ہیں

خدا نہیں ہے تو کیا ہے ہمارے سینوں میں
وہ اِک کھٹک سی جسے ہم ضمیر کہتے ہیں

محاوراتِ جنوں پر نہ جا' ہماری طرف
غریبِ شہرِ وفا کو امیر کہتے ہیں

وہ ایک سایۂ سَرِ راہ' اپنے پیکر کو
ہر اِک سے پوُچھتا ہے راہ گیر کہتے ہیں

شگفتِ گُل ہو کہ بارانِ اوّلیں کی مہک
پیامِ دوست بہ دستِ سفیر کہتے ہیں

ہمارے دُکھ کو عزیزو بھلا سا نام تو دو
ہمیں جو دُکھ ہے اُسے ناگُزیر کہتے ہیں

وہ کب کا ڈُوبا ہے لیکن ندی کے پانی پر
کھنچی ہوئی ہے ابھی تک لکیر کہتے ہیں

اُدھر ہے چاند اِدھر رُت جگوں کی دُھوم ہے شاذؔ
کرن کرن کو سوئمبر کا تیر کہتے ہیں

☆☆

O

یہ غزل کا فن یہ ہنروری، یہ خیال و خواب کی بُت گری
فقط ایک شخص کی دین ہے، کوئی حوُر ہے نہ کوئی پَری

پھر اُداس ہو گئی چاندنی، کسی دُھن میں کھو گئی چاندنی
کہ سکوتِ نیم شبی میں ہے کوئی لے چھپی ہوئی دُکھ بھری

وہ شگفتگیٔ لب و دَہن وہ قرار و وعدہ سُخن سُخن،
ہمہ انکساریٔ جان و تن تُو کہاں ہے خاتمِ دلبری

ترا حُسن دیدنی ہے وہاں، ہوں پَری رُخوں کے پَرے جہاں،
وہ ہجومِ دیدۂ آہُواں، وہ تری نِگاہ کی بَرتری

مجھے خاک کر گئیں دُوریاں، مرے شعروفن ہیں دُھواں دُھواں
میں ہُوں اُس مقام پہ اب جہاں مجھے دے نویدِ پیمبری

تہی جیب کوئی نہ بھر سکا، نہ اِدھر سے کوئی گذر سکا
ترا حُسن خود بھی نہ کر سکا، مری آرزُو کی برابری

نہ بھلائے شاذؔ کو بے سبب کہ قریب تر ہے وہ وقت اب
ترے دِل سے محو ہوں سب کے سب مہ وسالِ صحبتِ دلبری

☆☆

O

سینے پہ ہم نے رکھ لیا پتھر کسی طرح
آخر بھلا دیا اُسے روکر کسی طرح
ایسا کہاں ہے دشت کہ دیوار و دَر بھی ہو
چاہا ہزار چھٹ نہ سکا گھر کسی طرح
کوشش یہی رہی ہے مسرّت کے باب میں
آجائے تیرے غم کے برابر کسی طرح
اب یہ یقیں بھی وہم و گُماں تک پہنچ گیا
میں خود اسے مناؤں گا مِل کر کسی طرح
پردے کھِنچے ہوئے ہیں شبستانِ ذات میں
کچھ نُور چھَن ہی آتا ہے باہر کسی طرح
کیا آگ تھی کہ بُجھ نہ سکی تا بہ قلب و جاں
کیا بوجھ تھا کہ اُٹھ نہ سکا سَر کسی طرح
یاد اُس کی شاذؔ دِل سے بھلاتے تو ہو مگر
صحرا نہ بن سکے گا سمندر کسی طرح

☆☆

○

دُور تک ایک دُھندلکے کا سَماں چھایا ہے
دشت کیا ہے، مِری آواز کا سنّاٹا ہے

مَیں نے فطرت کو زَسَر تا بقدم دیکھا ہے
پھول ٹوٹا ہے تو مہتاب بھی گہنایا ہے

خشک پتّوں کی صدا مرثیۂ موسمِ گُل
لُو کا جھونکا کسی پُروائی کا خمیازہ ہے

ایک بے نام سی خواہش ہے کہ موہوم سی آس
زندگی جیسے کوئی وعدۂ خود ساختہ ہے

یہ ترا تارِ قبَا تارِ رگِ جاں جیسے
راگ اور آگ کا سنگم ترا پہناوا ہے

کہہ دو رُوٹھی ہوئی خوشبو سے کہ اب لَوٹ چلے
طاقِ گُل میں ابھی جگنو کا دیا جلتا ہے

میں سرِ صحنِ شفق ہوں کہ یقیں ہے مجھ کو
ایک بھٹکی ہوئی تتلی کا یہی رستہ ہے

کیا قیامت ہے مجھے حوصلۂ ضبط ہے شاؔذ
کیا غضب ہے کہ ترے درد کا اندازہ ہے!

☆☆

O

تُو کیا لگے ہے مجھے، کیوں بھلا لگے ہے مجھے
میں رُوبرو ہوں کہ تُو آئینہ لگے ہے مجھے

گھٹائیں آنے لگیں، دُوریوں کے جنگل سے
گھنیری شام ہے ٹھنڈی ہوا لگے ہے مجھے

اُتر چلی ہے رگ و پَے میں منزلوں کی تھکن،
ہر ایک پیڑ کا سَایہ گھنا لگے ہے مجھے

نفس جرس ہے، نظر رہنما، قدم منزل
اکیلا شخص بھی اک قافلہ لگے ہے مجھے

یہی تو ہے جسے سجدہ کیا مَلائک نے
کوئی یہ بات کہے تو حیَا لگے ہے مجھے

بُرائیاں تری دیکھی نہیں ہیں دُنیا نے
ترے مزاج کا یہ رُخ بھلا لگے ہے مجھے

بجز اِعادۂ عہدِ وفَا کچھ اور نہیں
کہ ہر سخن ترے مُنہ سے نیا لگے ہے مجھے

چھُوا ہوا ہے کوئی راگ زیرِ پیراہن،
تمام سَازِ بدن گونجتا لگے ہے مجھے

گریباں گیر ہے ہر لفظ سے معانی شاؔذ
میں شُکر کرتا ہوں لیکن گلہ لگے ہے مجھے

☆☆

O

دھوپ بھی چاندنی ہے سایۂ اشجار سے دیکھ
کوئی بازار سہی چشمِ خریدار سے دیکھ

دائرے، قوسیں، خطِ رنگ، بیاضِ دل پر
روز اِک عالمِ نو ہے تری رفتار سے دیکھ

جاگتے سوتے جزیروں کے دُھندلکے میں بُلا
پھر اُسی طرح مجھے پردۂ انکار سے دیکھ

پھر سزا وار ہے تجھ کو مرے ہر عیب سے پیار
پہلے تُو میرا ہُنر دیدۂ اغیار سے دیکھ

میں کہ پتھر سہی، تعبیرِ صنم خانہ ہُوں
تُو مرا شعلۂ جاں تیشے کی جھنکار سے دیکھ

زد میں آتے رہے تیرے شہ و فرزیں کیا کیا
اپنی جیتی ہوئی بازی کو مری ہار سے دیکھ

شاذ سورج بھی تماشائی ہُوا آج کے دن
رخصتِ سایۂ دیوار ہے، دیوار سے دیکھ

☆☆

نیم خواب

امتیاز کے نام ———

ترتیب

☆☆

اَز بُنِ ہر مژہ صد قطرۂ خوں بیش چکید،

(حافظؒ)

نعت

آپؐ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رولوں گا
دُنیا جیسے ایک کھلونا
ہر پہلو رنگین سلونا
عُمر کٹی ہے سمجھانے میں
اپنے آپ کو بہلانے میں
دفترِ حسرت اپنے خدا کے آگے کیسے کھولوں گا
آپؐ اکیلے مِل جائیں تو دامن تھام کے رولوں گا
جی غم سے ہے بوجھل بوجھل
رات اندھیری گھرے بادل
اپنے گناہوں کی ہے کہانی
بہتے ہوئے اشکوں کی زبانی
سب کے آگے کیسے بولوں، تنہائی میں بولوں گا
آپؐ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رولوں گا
بھیڑ بہت ہوگی تو کیا غم
میرا مقدّر دیدۂ پُرنم
جب مہکے خوشبوئے بہاری
جب اُترے جلوے کی سواری
میں تو سراپا نادم نادم پیچھے پیچھے ہولوں گا
آپؐ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رولوں گا

کوئی کیا دے کوئی کیا لے
حسنِ طلب کے ڈھنگ نرالے
کس سے مانگوں کیا کیا مانگوں
دُنیا مانگوں، عُقبیٰ مانگوں
آپؐ کے دستِ کرم سے لوں گا سوچ رکھا ہے جو لوں گا
آپؐ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا
کس سے پیماں باندھ رہا ہوں
خاک ہوں لیکن میں بھی کیا ہوں
کس کے ہجر کا غم سہتا ہوں
میری سُنو میں سچ کہتا ہوں
گاہک ہوں گے چاند اور سورج جب اشکوں کو تولوں گا
آپؐ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا
شاذ وطن میں بے وطنی ہے
آگے دیکھو چھاؤں گھنی ہے
ہجر کا قصہ پاک کرو بھی
دامنِ جاں اب چاک کرو بھی
عمر کی رات آنکھوں میں کٹی ہے پَل دو پَل کو سو لوں گا
آپؐ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا

☆☆

قطعات

کیف، اُمید، انبساط، اُمنگ
پئے دیدار لے کے جاتا ہوں
درد، وارفتگی، کسک، اُلجھن
لَوٹتے وقت ساتھ لاتا ہوں

O

ڈُوبتا زرد سا مہتاب دمِ آخرِ شب
مجھ کو معلوم نہ تھا رُوح کو دہلاتا ہے
نگہِ جورِ عزیزانِ سُبک سر کا ملال
تیری چاہت، ترے الطاف سے مٹ جاتا ہے

O

کتنے تلخاب اُتارے ہیں تہِ کام و دہن
کتنے صحراؤں کی پہنائیاں کاٹیں میں نے
مدّتوں بعد کھلا رازِ تمنّا مجھ پر
محفلیں بوئی تھیں، تنہائیاں کاٹیں میں نے

☆☆

O

کوئی تو آکے رُلا دے کہ ہنس رہا ہوں میں
بہت دنوں سے خوشی کو ترس رہا ہوں میں

سحر کی اوس میں بھیگا ہوا بدن تیرا
وہ آنچ ہے کہ چمن میں جھلس رہا ہوں میں

قدم قدم پہ بکھرتا چلا ہوں صحرا میں
صدا کی طرح مکینِ جرس رہا ہوں میں

کوئی یہ کہہ دے مری آرزو کے موتی سے
صدف صدف کی قسم ہے برس رہا ہوں میں

حیاتِ عشق مجھے آج اجنبی نہ سمجھ
کہ سایہ سایہ ترے پیش و پس رہا ہوں میں

نفس کی آمد و شد بھی ہے سانحہ کی طرح
گواہ رہ کہ ترا ہم نفس رہا ہوں میں

جہاں بھی نُور ملا کھِل اُٹھا شفق کی طرح
جہاں بھی آگ ملی خار و خس رہا ہوں میں

میں کیا کروں کہ مری آس ٹوٹتی ہی نہیں
شعاعِ روزنِ بابِ قفس رہا ہوں میں

نہ چھو سکے کوئی مجھ کو نہ میں کسی کے لئے
کسی شوالے کا جیسے کلس رہا ہوں میں

تلاشِ نغمۂ آوارہ کائنات مری
تمام تار شکستہ ہیں کس رہا ہوں میں

حیات راہ کی دیوار بن گئی ہے شاؔذ
اک آئینہ ہے شب و روز ڈس رہا ہوں میں

☆☆

O

کاروبارِ سحر و شام میں نقصان نہیں
ہائے وہ شخص کہ جس کا کوئی ارمان نہیں

یہ بجا ہے کہ ابھی جسم کا زندانی ہوں
یہ غلط ہے کہ مری رُوح پشیمان نہیں

تُو ابھی تک مرے جینے کا سبب ہو جیسے
تو مرے ساتھ نہیں میرا نگہبان نہیں

بڑھ گئے اور بھی غم اک ترے کم ملنے سے
یوں بھی اس دور میں جینا کوئی آسان نہیں

یا صبا ہی مرے ویرانہ سے برگشتہ ہے
یا تری نکہتِ گیسو ہی پریشان نہیں

میرے دروازہ پہ پھر تیری سواری ٹھہرے
کیا کوئی آس نہیں کیا کوئی امکان نہیں

ایک جیسے نظر آتے ہیں مجھے سب چہرے
تُو کہاں ہے کہ کسی رنگ کی پہچان نہیں

شاذؔ ہونٹوں پہ دُعا آکے پلٹ جاتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ الفاظ میں اب جان نہیں

☆☆

O

دامن ہے دُور اور گِلے نارسا کے ہیں
یعنی ہمارے ہاتھ فقط اب دُعا کے ہیں

باغِ وفا میں جھوم رہی ہے کلی کلی
جھونکے جو لگ رہے ہیں وہ بادِ فنا کے ہیں

دشوارئِ حیات میں کھو سے گئے ہیں ہم
گویا یہ مرحلے ترے بندِ قبا کے ہیں

تیری سپردگی نے مجھے خاک کردیا
دل میں جو زخم ہیں تری مہر و وفا کے ہیں

شانہ ہلا ہلا کے جگاتے ہیں روز و شب
جتنے پیام ہیں مرے دیرِ آشنا کے ہیں

تلوار کی طرح ہے زمانہ کھنچا ہوا
سارے غُبار جیسے تری خاکِ پا کے ہیں

کیوں ناخدا سے شکوۂ موجِ بلا ہے شاذؔ
کشتی اُدھر چلی ہے جدھر رُخ ہوا کے ہیں

☆☆

O

ذوقِ تنہائی فزوں ہوگیا کم تھا پہلے
کیا کہیں تیری رفاقت کا بھرم تھا پہلے

فرق ہی کیا ہے نظر آئے کہ چھپ جائے کوئی
اب مرے حق میں خدا ہے جو صنم تھا پہلے

آج مغرور ہی کہلاتے ہیں، ایسا ہی سہی
تیری چوکھٹ تھی تو سر اپنا بھی خم تھا پہلے

جاگ اُٹھا پھر وہی سویا ہوا غم تیرے بعد
تجھ سے ملتے ہوئے جس بات کا غم تھا پہلے

آج اک دوسرے کو دیکھ کے رہ جاتے ہیں
شاذؔ کیا روتے تھے کیا عیشِ بہم تھا پہلے

☆☆

دردِ پذیرائی

جی میں ہے خاطرِ بے تاب کا افسانہ لکھوں
حالِ جاناں نہ کہوں، نازشِ تُرکاں نہ لکھوں
جانبِ شہرِ تمنّا دلِ دیوانہ چلے
گُل کھلے، ساز چھڑے، رنگ اُڑے، شمع جلے
عقل کو صید کروں، عشق کو صیّاد کروں
وہی اسباق جو ازبر ہیں، اُنھیں یاد کروں
پھول سی خوشبو ہے دُہرائی ہوئی باتوں میں
کتنی صُبحوں کا اُجالا ہے مری راتوں میں

O

میری تقویمِ محبت کے شب و روزِ وفا
ادب و شعر کی تاریخ و روایت سے جُدا
آدمی زاد کو قاتل نہیں کہتا زنہار
زُلف کو مار سمجھتا ہوں نہ ابرو کو کٹار
فطرتِ حُسن ہے سرتا بہ قدم سوز و گداز
میں نے دیکھے ہی نہیں جور و جفا کے انداز
چمنِ عشق میں پائی ہی نہیں بُوئے رقیب
مطلعِ شوق پہ اُبھرا ہی نہیں روئے رقیب
حُسن آماجگہِ نور ہے مشرق کی طرح
میں نے معشوق بھی پایا ہے تو عاشق کی طرح

آنکھ اُٹھاتا ہوں تو وہ آنکھ جُھکی جاتی ہے
لب ہلاتا ہوں تو تائید ہوئی جاتی ہے

وہ کہ ہے نازِ حرم، لطف و کرم، قول و قسم
بہرِ انفاس خدا ہے پئے نظارہ صنم

جانبِ قبلۂ خُوباں سے گھٹا آتی ہے
کوئے نازش سے قدم لینے ہوا آتی ہے

سخت مشکل ہے یہاں تفرقۂ ناز و نیاز
میری آواز بنی جاتی ہے دوہری آواز

ہاتھ بڑھتے ہیں تو ملتے ہیں سہارے کیا کیا
یم بہ یم دجلہ بہ دجلہ ہیں کنارے کیا کیا

روشنی چہرے پہ دیدار کی تقریب کی طرح
وہ نمو یافتہ قامت کسی تشبیب کی طرح

جسم کے خط ہیں کہ باریک قلم کی تحریر
صاف و شفاف کہ تقدیر رقم کی تحریر

بجلیاں پس کے گھلی جاتی ہیں رُخساروں میں
ست رنگے پھول کھلے جاتے ہیں انگاروں میں

صفِ مژگاں کہ سوئمبر کا سماں ہو جیسے
نکہت زُلف کہ خوشبو کا دُھواں ہو جیسے

موجۂ رنگ، سرِ بادِ شُمال اُڑتا ہے
دیکھنا پائے حِنائی سے گُلال اُڑتا ہے

وہ لگاوٹ کا تقاضا ہے کہ لے لے سب کچھ
وہ نظر گفتنی، ناگفتنی کہہ دے سب کچھ

چُستیٔ عضوِ بدن جوششِ دریا جیسے
ٹوٹنے والا ہو چڑھتا ہوا چلّہ جیسے

لب کہ گُل بستہ و غنچہ صفت و شہد آثار
لب کہ بیمار مسیحا ہو، مسیحا بیمار
لب کہ ہر ذرّۂ بے جاں کو کریں نُطق فشاں
لب جنھیں دیکھ کے ہو قُم کے تقاضہ کا گُماں
لب کہ خلوت میں کُھلیں جیسے کُھلے ساتواں در
اور محفل میں رہیں دولتِ ممسک بن کر
آنکھیں سوئی ہوئی، روئی ہوئی بوجھل آنکھیں
گھر کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی پاگل آنکھیں
دہر افروزِ وفا ساغرِ جم ہیں آنکھیں
اپنے سمٹے ہوئے پیکر کا بھرم ہیں آنکھیں
صاف ترشی ہوئی خورشید کی پھانکیں آنکھیں
روزنِ دَر میں بنیں زر کی شعاعیں آنکھیں
دل کی دھڑکن کی بھی آواز سُنیں وہ آنکھیں
شورشِ دہر میں سناٹے بُنیں وہ آنکھیں
آنکھیں ترسی ہوئی، برسی ہوئی، پیاسی آنکھیں
چوُر، سرشار، گراں بار، ہنداسی آنکھیں
تنکے چنتی ہوئی، روئی ہوئی، حیراں آنکھیں
سنگ پلکوں سے ہٹاتی ہوئی گریاں آنکھیں
میں اِنہی آنکھوں کی تنویر لئے پھرتا ہوں
ایک تصویر سی تصویر لئے پھرتا ہوں

O

میں کہ محرومِ تماشہ نہ پشیمانِ وصال
پھر مرے آئینۂ دل پہ ہے کیوں گردِ ملال

سوچتا ہوں کہ مرے عشق کی فطرت کیا ہے
میری افتاد ہے کیا میری طبیعت کیا ہے
کامرانی پہ بھی دل کیوں سپر انداختہ ہے
وہ ہُنر دپائی ہے میں نے کہ جُنوں ساختہ ہے
رات بھر جاگتا رہتا ہے سرہانے کوئی غم
ڈھونڈھتا پھرتا ہے کیا کچھ نہ بہانے کوئی غم
حُسن کو کس نے سِکھایا ہے نگہباں ہونا
کوئی دیکھے تو مرا بے سروساماں ہونا
آنکھ خونابہ فشاں کب ہے کہ دامن ڈھونڈوں
کُنجِ گُل پایا ہے کیوں شاخِ نشیمن ڈھونڈوں
سببِ شکوہ نہیں آہ کروں یا نہ کروں
پہلو آباد ہے کِس واسطے پہلو بدلوں
پھر یہ موہوم رگِ جاں کی کسک کیا ہوگی
سینۂ شوق میں نشتر کی کھٹک کیا ہوگی
ایک پیمانہ سا آنکھوں میں چھلکتا کیا ہے
دل تو شیشہ ہے یہ پتھر پہ دھڑکتا کیا ہے
شور سا اُٹھتا ہے کیوں پچھلے پہر دل کے قریب
کون رہرو ہے جو لُٹ جاتا ہے منزل کے قریب
کس کو دکھلاؤں کہ کیا کیا نظر آتا ہے مجھے
دہر یک گوشۂ صحرا نظر آتا ہے مجھے
گاہ دوری میں سکوں ملتا ہے، چین آتا ہے
دل مگر دردِ شکیبائی سے تھراتا ہے
لمحہ لمحہ بھی قیامت ہے کہ بھاری گذرے
زندگی صورتِ انفاس شماری گذرے

بات تو جب تھی کہ ہوتا کوئی بیداد کا زخم
زخمِ نغمہ ہے نہیں نالہ و فریاد کا زخم
ایک ہی درد کی پہچان نہ ہوتے اے کاش
ہم کہ یک قالب و یک جان نہ ہوتے اے کاش
گنگنانے پہ اگر ساز نہ دیتا کوئی
میری آواز پہ آواز نہ دیتا کوئی
لُطف کرتا نہ کوئی ناز اُٹھاتا نہ کوئی
میری ہر بات سے سو راز بناتا نہ کوئی
میں کہ نشتر بہ رگِ جاں نہیں ہوتا اے کاش
زحمتِ دل چاک گریباں نہیں ہوتا اے کاش
کس کو معلوم تھا ہوتی ہے مسرّت بھی حزیں
حُسن کی خُو بھی حزیں عشق کی فطرت بھی حزیں
مدّتوں بعد کھُلا عقدۂ مشکل مجھ پر
تنگ ہے راہِ جنوں سخت ہے منزل مجھ پر
آگ سی آگ رگ و پے میں سمونا ہے ضرور
وہ کرم ہو کہ ستم عشق میں رونا ہے ضرور

☆☆

کمیں گاہ

شاذ کیا رات ہے، کیا تیز ہوا ہے مری جاں
تم کہاں اپنے چراغوں کو جلانے نکلے
تم نے دستک دی ضمیروں کے نہاں خانہ پر
اژدر و مار کے مسموم ٹھکانے نکلے
تم نے رنگین نقابوں کو بھی چہرہ جانا
کتنے ہشیار ہو تم، کتنے سیانے نکلے

گر یہی نائبِ یزداں ہیں تو ابلیس ہے کون
کون جیتا ہے یہاں حق کے رسولوں کی طرح
شام ڈھل جائے تو پھر پھول کی اوقات ہے کیا
جاوداں کون ہے صحرا کے ببولوں کی طرح
دست و بازوئے عدالت سے لہو جاری ہے
منصفی ٹھہری، جرائم کے اُصولوں کی طرح

ریت کو آبِ بقا زہر کو نوشینہ کہو
خرِ پالنگ کو شبدیز کا ثانی سمجھو
سچ کو فرسودہ کہو گفتہ کو ناگفتہ کہو
پائے طاؤس کو نقاشیِ مانی سمجھو
چاند کو داغ کہو، مہر کو انگارہ کہو
سحر و شام کو پریوں کی کہانی سمجھو

تم لطافت کی دُکاں کھول کے بیٹھے ہو کہاں
جنس نایاب سہی کوئی خریدار بھی ہو
کس کو دِکھلاتے ہو پیمانۂ گُل کی سُرخی
کور چشم اور بھلا خواہش دیدار بھی ہو!
نغمہ پیرائی ہے تسلیم مگر گوش کہاں
قدرِ عیسیٰ ہے سلامت کوئی بیمار بھی ہو

تم کو آدابِ جہاں آئیں تو کب آئیں گے
شاعری، سادہ دلی، بے خبری کچھ بھی نہیں
یہ جہاں ایک کمیں گاہ ہے، فردوس نہیں
حُسنِ ظن کچھ بھی نہیں خوش نظری کچھ بھی نہیں
جانبِ پُشت بھی دیکھا کرو گاہے گاہے
ایک منزل ہے مگر ہم سفری کچھ بھی نہیں

☆☆

O

سُن کر بیانِ درد کلیجہ دہل نہ جائے
دُنیا سے ڈر رہے تھے کہ دُنیا بدل نہ جائے

ہر محفلِ نشاط سے پھرتا ہوں دُور دُور
کیا احتیاط ہے کہ ترا غم بہل نہ جائے

تُو آج تک تو ہے مری نظروں میں ہُو بہو
دُنیا بدل گئی تری صورت بدل نہ جائے

ہیں طاقِ آرزو پہ کھلونے سجے ہوئے
مایوسِ آرزو کی طبیعت مچل نہ جائے

تشنہ لبی کہیں مجھے غرقاب کر نہ دے
تھوڑی سی روشنی کے لئے گھر ہی جل نہ جائے

اک خوف ہے کہ منزلِ نسیاں قریب ہے
تو وادیِ خیال سے آگے نکل نہ جائے

روؤں کہاں کہ راحتِ خلوت نہیں ہے شاذؔ
ہنسنے پہ بھی یہ شرط کہ آنسو نکل نہ جائے

☆☆

O

رُخِ حیات کسی سمت موڑ دے کوئی
خُدا کرے مری یادوں کو لُوٹ لے کوئی

وہ سُن رہا تھا خدائے کریم کے مانند
مرا یہ حال کہ جیسے دُعا کرے کوئی

خوشی کے دن نہ تھے قُدرت مذاق کرتی تھی
تمام عُمر کے رونے کو کیا کہے کوئی

نہ پوچھ کیسی لگی شہرِ غم کی آب و ہوا
اُٹھا رہا ہے ترے ہجر کے مزے کوئی

کوئی نہیں تو مجھے شعر کا سہارا ہے
کہ بات کرتا ہو جیسے قریب سے کوئی

نہ میرا ذکر کہیں ہو نہ میں نظر آؤں،
خراب ہو کے محبت میں کیا کرے کوئی

تُو جا رہا ہے تو، آ ایک بار مِلتا جا
کہ عُمر بھر کی تمنّا تو سونپ دے کوئی

میں سوچتا تھا مرا حال تجھ پہ روشن ہے
کس اعتماد سے تکتا رہا تجھے کوئی

وفا کی میں نے مگر اُس نے کیوں وفا کی شاذؔ
میں رو رہا ہوں مرے حال پر ہنسے کوئی

☆☆

بیداد

شام کے رنگ میں گھل جاتے ہیں گہرے سائے
پاس کے پیڑ سے گرتے ہیں سنہری پتّے
راہ گیروں کے قدم پڑتے ہیں
میرے احساس میں کہرام سا مچ جاتا ہے
زرد پتّوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں میں
وہ مجھے روکتی ہے
میں اُسے دیکھتا ہوں
خوں بہا جیسے طلب کرتا ہو، قاتل سے کوئی
جس طرح اندھے کنوئیں میں کوئی جھانکے ڈر جائے
وہ مجھے دیکھتی ہے
جیسے سُولی پہ لٹکتا ہوں میں
اور بس کہنے کو ہوں آخری خواہش اپنی
وہ مجھے دیکھتی ہے
اور میں فرطِ ندامت سے کھڑا ہوں چُپ چاپ
پاس کے پیڑ سے گرتے ہیں سنہری پتّے
راہ گیروں کے قدم پڑتے ہیں
میرے احساس میں کہرام سا مچ جاتا ہے
زرد پتّوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں میں
وہ مجھے روکتی ہے
چند لمحوں کے لئے خامشی چھا جاتی ہے

دھیرے دھیرے وہ سُناتی ہے مجھے
اک کہانی کہ جو اب یاد نہیں
اور میں جس کو بھلا بھی نہ سکا

زرد وادی وہ نشیب
سبز چوبی در و دیوار کا گھر
جس کی خاموش فضا
کسی گذرے ہوئے طوفاں کا پتہ دیتی ہے
کہتی جاتی ہے وہ زینو کے شب و روز کا حال
یوں چھٹی مانگ سے افشاں اُس کی
جس طرح پھول سے زیرہ جھڑ جائے
رات بھر جاگتی رہتی ہے ستاروں کی طرح
موم بتی کی طرح روتی ہے
آنکھ لگ جاتی جب پچھلے پہر
صبح دیتی ہے کرن کی دستک
سورج آ آ کے پلٹ جاتا ہے
اب تو دن رات کا احساس کہاں ہے اُس کو
آج بھی آتی ہے بالوں کی سیہ لٹ رُخ پر
لیکن اب اس کو ہٹانے کے لئے
وہ کبھی ناز سے گردن کو جھٹکتی بھی نہیں
وہ کلائی کا گُداز
چوڑیاں جس میں پھنسی رہتی تھیں
اب یہ عالم ہے کہ ہاتھوں سے نکل پڑتی ہیں
جاگتی آنکھوں کے بھاری پن میں
ایک غم ہے جو رگِ جاں میں اُتر جاتا ہے

رُخ پہ ہیں ایسی نقاہت کے سلونے سائے
اِنکساری سے مشابہ کوئی شئے
کچھ ملنساری سے ملتی جُلتی
سر بسر لُطف و کرم
ایک تصویر ہے سوندھے پن کی
ایک کیفیتِ بے نام ہے سر تا بہ قدم

O

میں ندامت سے کھڑا ہوں چُپ چاپ
وہ مجھے دیکھتی ہے
میں خلاؤں میں کہیں دُور تکے جاتا ہوں
زرد وادی وہ نشیب
سبز چوبی درو دیوار کا گھر
جس کی خاموش فضا
کسی گذُرے ہوئے طوفاں کا پتہ دیتی ہے

O

مجھ کو رہ رہ کے خیال آتا ہے
میں نے کیا ظلم کیا زینو پر
دل کہیں واقعی پتھر تو نہیں
گو مری آنکھیں نم آلود ہیں لیکن دل میں
ایک ہلکی سی مسرّت کی کرن پاتا ہوں
آپ اپنے سے یہ کہتے ہوئے اِتراتا ہوں
لو چلو آج یہ دن بھی آیا
ناز اٹھوانے کا ارماں نکلا
چاہے جانے کی تمنّا نکلی!!

☆☆

خوف کا صحرا

کیا ہوا شوقِ فضول
کیا ہوئی جرأتِ رندانہ مری
مجھ پہ کیوں ہنستی ہے تعمیرِ صنم خانہ مری
پھر کوئی بادِ جنوں تیز کرے
آگہی ہے کہ چراغوں کو جلاتی ہی چلی جاتی ہے
دُور تک خوف کا صحرا نظر آتا ہے مجھے

O

اور اب سوچتا ہوں فکر کی اِس منزل میں
عشق کیوں عقل کی دیوار سے سر ٹکرا کر
اپنے ماتھے سے لہو پونچھ کے ہنس پڑتا ہے

☆☆

تضمین بر غزلِ غالبؔ

نغمہ حریف سازِ عنادل نہیں رہا
سودا، شریکِ شورِ سلاسل نہیں رہا
نالہ، گدازِ درد کا حاصل نہیں رہا
''عرضِ نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا''

تھا دوش پر ندامتِ ہستی لئے ہوئے
خوفِ عدم بہ وحشتِ ہستی لئے ہوئے
میں تھا جہاں میں تہمتِ ہستی لئے ہوئے
''جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ در خورِ محفل نہیں رہا''

تنگ اور قیدِ زُلفِ گرہ گیر کر کہ میں
طرزِ دگر سے پھر مجھے زنجیر کر کہ میں
فرمانِ تازہ قتل کا تحریر کر کہ میں
''مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا''

ناز و نیازِ شوق کا قصہ دراز ہے
شیشہ نظر کا جلوہ کی مئے سے گداز ہے
کیا رنگ و نُورِ ظلمتِ ہستی کا راز ہے
''بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے

یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا"

رحلِ نظر پہ جیسے دھری ہے کتابِ حُسن
مستی فروش و نغمہ بہ قامت شبابِ حُسن
شبنم بدست و صبح بہ پہلو گلابِ حُسن
"واکردیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا"

تحریرِ عہدِ لطف و عطا مٹ گئی کہ یاں
تاثیرِ سوزِ حرفِ دُعا مٹ گئی کہ یاں
تہذیبِ عشق و جرم و سزا مٹ گئی کہ یاں
"دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ یاں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا"

ہم جانتے ہیں شاذؔ کہ ہے دیدہ ور اسدؔ
مانا کہ خوار و خستہ ہے بے بال و پر اسدؔ
گو ہے رہینِ گردشِ شام و سحر اسدؔ
"بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

☆☆

تضمین بر غزلِ غالبؔ

اب بھلا کیا ذکر کیجئے کیا رہا کیا جل گیا
ہائے کیا کیا ساز و برگِ عیشِ رفتہ جل گیا
صورتوں کا ذکر کیا آئینہ خانہ جل گیا
''دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا''

کیا ہوئی زنجیرِ غم جھنکار تک باقی نہیں
اب کہاں سر پھوڑیئے دیوار تک باقی نہیں
کیا عمارت ڈھ گئی آثار تک باقی نہیں
''دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا''

سر تو ہے لیکن نہیں سودائے گیسوئے نگار
اک خرابہ حسرتوں کا ہے قطار اندر قطار
تاب و تب باقی نہیں گو یاد ہیں قصے ہزار
''دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اِس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا''

☆☆

تضمین بر غزلِ اقبالؔ

دلِ ازل میں جو تھا ذوقِ جستجو میں ہوں
تمام سازِ تمنا تمام سوزِ دروں
چھپائے پھرتا ہوں سینہ میں قلزم و جیحوں
"وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفَسِ جبرئیل دے تو کہوں"

ہُنر فریفتہ ہی قیمتِ ہُنر دے گا
سکوتِ سنگ کہاں دادِ شیشہ گر دے گا
تہی پیالہ، تہی دست کیسے بھر دے گا
"ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں"

نگاہ کیا ہے نظاروں کی جانِ محبوبی
جنون کیا ہے شکیب و قرارِ ایوّبی
وجود کیا ہے عناصر کی عرش مندوبی
"حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں"

تمام پردہ ہیں وہ ذوقِ روشنی دے کر
ازل سے تا بہ ابد لطفِ تشنگی دے کر
جنوں کے ہاتھ میں قندیلِ آگہی دے کر

''عجب مزہ ہے مجھے لذّتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں''

فرازِ طورِ جنون و دراز دستیِ شوق
متاعِ درد و سرشتِ وفا و ہستیِ شوق
گدازِ قلب و مئے ذات و خود پرستیِ شوق
''ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں''

ہے اپنے شوق کا احساس ابتدا سے مجھے
ملی ہے تابِ سخن بامِ کبریا سے مجھے
ہزار ناز سے کہنا ہے یہ خُدا سے مجھے
''سبق ملا ہے یہ معراجِ مُصطفٰی سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردُوں''

طلوعِ جلوہ پسِ اوجِ بام ہے شاید
مئے کشیدۂ لمحات خام ہے شاید
مسافتِ بشری چند گام ہے شاید
''یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں''

☆☆

O

مثالِ شعلہ و شبنم رہا ہے آنکھوں میں
وہ ایک شخص جو کم کم رہا ہے آنکھوں میں

کبھی زیادہ کبھی کم رہا ہے آنکھوں میں
لہو کا سلسلہ پیہم رہا ہے آنکھوں میں

نہ جانے کون سے عالم میں اُس کو دیکھا تھا
تمام عُمر وہ عالَم رہا ہے آنکھوں میں

تری جُدائی میں تارے بجھے ہیں پلکوں پر
نکلتے چاند کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

عجب بناؤ ہے کچھ اُس کی چشمِ کم گو کا
کہ سیلِ آہ کوئی تھم رہا ہے آنکھوں میں

وہ چھپ رہا ہے خود اپنی پناہِ مژگاں میں
بدن تمام مجسم رہا ہے آنکھوں میں

اَزل سے تابہ ابد کوششِ جواب ہے شاذؔ
وہ اک سوال جو مُبہم رہا ہے آنکھوں میں

☆☆

O

جانے والے تری تاکید پہ روؤں کہ ہنسوں
کہ ترے بعد میں اچھا بھی رہوں، خوش بھی رہوں

دلِ برباد کا کچھ دن سے تقاضا یہ ہے
غمگساروں سے بھی احوال چھپائے رکھوں

نقشِ پا چھوڑے تھے ہم دونوں نے جن راہوں پر
میں وہاں جاؤں ذرا دیر کو ٹھہروں، رو دوں

ایک پہلو پہ گذرتی ہے مری عُمر کی رات
میرے اللہ کو معلوم ہے، کس حال میں ہوں

جاگتی آنکھوں نے دیکھی ہے تری شامِ وداع
نیند میں دیکھ لوں یہ کرب تو میں چیخ پڑوں

تو مرے واسطے بے مہریِ حالات نہ بن
مجھ سے ملنا ہے تو یوں مل کہ میں پہچان سکوں

شاؔذ جو جانے وہی جانے برابر کی یہ آگ
کم نہیں عشق سے کچھ حُسن کا اندازِ جنوں

☆☆

O

شعلے ہیں زخمِ دل ہے مرے پاس چھین لے
صحرا نشینِ شہر سے بن باس، چھین لے

فانوسِ جاں کا شیشۂ دیوار توڑ دے
رقصاں ہے رنگِ شعلۂ احساس، چھین لے

دل کی زمیں پہ نصب ہیں کتبے، نکال پھینک
مٹی کے اِن گھروندوں سے انفاس، چھین لے

میں اپنا ریگ زارِ تمنا سمیٹ لوں،
تو مجھ سے اپنی سونپی ہوئی پیاس، چھین لے

انصاف کر، یہ روز کا جھگڑا چکا بھی دے
آ، ایک بار آ کے مری آس، چھین لے

مصرِ وفا سے رونقِ بازار چھین لی
یوسف کے پیرہن سے بھی بُوباس، چھین لے

تو خیریت سے ہو بھی تو یہ بیم و خوف کیوں
آتے ہیں جی میں سینکڑوں وسواس، چھین لے

☆☆

O

جانے کیا قیمتِ اربابِ وفا ٹھہرے گی
میں اگر عرض کروں گا تو خطا ٹھہرے گی

نوکِ نشتر سے کھلائی گئیں کلیاں کتنی
جانے اس شہر کی کیا آب و ہوا ٹھہرے گی

رقصِ پروانہ کی گردش جو تھمے آخرِ شب
اہلِ محفل کے لئے یہ بھی ادا ٹھہرے گی

آج کے دور میں ویرانے بھی تعمیر ہوئے
کل کی تہذیب خُدا جانیئے کیا ٹھہرے گی

مدّتوں بعد کسی بند دریچے کے قریب
کیا خبر تھی مری رفتار ذرا ٹھہرے گی

تیری آواز مرے واسطے صحرا کا سکوت
میری خاموشی رہ و رسمِ دُعا ٹھہرے گی

لوگ رہتے ہیں یہاں خالی مکانوں کی طرح
کس کے دروازہ پہ دستک کی صدا ٹھہرے گی

شاؔذ اُدھر خواب کے دریا پہ ملے گا کوئی
ایک پرچھائیں سرِ آب، سُنا ٹھہرے گی

☆☆

O

دُور تک دُھندلکا ہے دُور تک دُھواں دیکھوں
تو کہاں نظر آئے میں تجھے کہاں دیکھوں

نخلِ یاد کا سایہ پَر سمیٹ لیتا ہے
میں شکستہ پا کب تک راہِ رفتگاں دیکھوں

جاتے جاتے اُس نے کیا وسعتیں عطا کی ہیں
جس طرف نظر ڈالوں دشتِ بیکراں دیکھوں

رنگِ پیرہن کی یاد شعلۂ بدن کی یاد
جب تری جدائی میں صُبح کا سماں دیکھوں

میرا اور دُنیا کا پھر سے معرکہ ٹھہرے
پھر ترے تبسّم کی صُلح درمیاں دیکھوں

راہ بھول بیٹھا ہوں آرزو کی بستی میں
وہ مکیں کہاں ہوگا کون سا مکاں دیکھوں

مجھ سے تنکے چُنوائے تیری جستجو ہائے
تو جہاں نہیں ہوگا میں وہاں وہاں دیکھوں

کچھ نہ کچھ تو اُس کو بھی یاد رہ گیا ہوگا
میں تو عُمر بھر شائد ایک ہی سماں دیکھوں

پھر سے دل دھڑک جائے پھر سے آنکھ بھر آئے
شاذؔ پھر سرِ راہے اُس کو ناگہاں دیکھوں

☆☆

پیاس

ابھی رخصت ہوئے مل بیٹھ کے ہنس بول کے تم
پھر وہی یاد وہی دید کی حسرت وہی پیاس
یہ مری گونجتی تنہائی یہ میرا بن باس

تم مرا راز ہو سانسوں میں بسو، دل میں رہو
تم مرا گیت ہو ہر ساز پہ گا لوں گا تمہیں
روز کھوتا ہوں مگر مہرِ جہاں تاب کی طرح
کہ دمِ صبح در و بام پہ پالوں گا تمہیں
اب جو دیکھوں گا تو بس دیکھتا رہ جاؤں گا
اب ملو گے تو نگاہوں میں چھپا لوں گا تمہیں

جانِ شاعر تمہیں اب تک نہیں دیکھا میں نے
آنکھ بھر کر تمہیں اب تک نہیں دیکھا میں نے
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے یہ ممکن بھی نہ تھا

☆☆

نکہتِ آسودہ

لمس کی آنچ سے ہر پور میں مہکار سی ہے
گردشِ خوں ہے کہ شریانوں میں جھنکار سی ہے

O

آنکھیں جھکتی ہیں بہ افراطِ حجابِ دوشیں
شب کے پارے ہوئے کاجل کی چمک مدّھم ہے
لحنِ زیرِ لب و قوسِ تبسّم موہوم
احتیاط اتنی کہ کنگن کی کھنک مدّھم ہے
چمپئی چھوٹ سی چھنتی ہوئی گھونگھٹ کے تلے
تیز ہے شعلۂ رُخ، دل کی کسک مدّھم ہے
گل کترتی ہوئی انگڑائی کی محرابِ دونیم
شاخِ ہر عضو کے غنچوں کی چٹک مدّھم ہے

O

کون جاگا ہے دمِ صبح سرِ بالشِ ناز
زُلفِ پُرپیچ و لباسِ شکن آلودہ لئے
موجِ انفاس میں اک نکہتِ آسودہ لئے

☆☆

دائرہ

پلکیں نیندوں کے پَچور، آنکھیں شبستاں کے چراغ
سخنِ زیرِ لبی، مُشک کے جھونکے جیسے
لفظ نوشتیہ تو لہجہ ہے شکرقند کی طرح
جملے اِس چاؤ سے پورے ہوں کہ وعدے جیسے
پیاس کی آنچ سے چٹخے نہ بدن کا بلّور
قوسِ ملبوس میں جلتے ہوں شوالے جیسے
ہرِ بُنِ مُو ہے ہم آغوشیٔ پنہاں کی پُکار
تارگِس دیں تو کھنک اُٹھتے ہوں پردے جیسے

O

اے دلِ زود فراموش خبر ہے کہ نہیں
زندگی آپ کو اِس طرح بھی دُہراتی ہے
کبھی نارنجی کبھی سُرخ کبھی سبز قبا
وہی لڑکی ہے جو سو رنگ سے آجاتی ہے

☆☆

O

میں تو چُپ تھا مگر اُس نے بھی سُنانے نہ دیا
غمِ دُنیا کا کوئی ذِکر تک آنے نہ دیا

اُس کا زہرا بہ ُ پیکر ہے مری رگ رگ میں
اُس کی یادوں نے مگر ہاتھ لگانے نہ دیا

اُس نے دُوری کی بھی حد کھینچ رکھی ہے گویا
کچھ خیالات سے آگے مجھے جانے نہ دیا

بادباں اپنے سفینہ کا ذرا سی لیتے
وقت اتنا بھی زمانہ کی ہوا نے نہ دیا

وہی انعام زمانہ سے جسے ملنا تھا
لوگ معصوم ہیں کہتے ہیں خُدا نے نہ دیا

کوئی فریاد کرے گونج مرے دل سے اُٹھے
موقعِ درد کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا

شاؔذ اک درد سے سو درد کے رشتے نکلے
کن مصائب نے اُسے جی سے بھلانے نہ دیا

☆☆

O

نکہتِ گیسوئے جانانہ چلی آتی ہے
لاکھ پردوں سے حریفانہ چلی آتی ہے

درد جاگ اُٹھتا ہے سو سو طرح پہلو پہلو
یاد افسانہ در افسانہ چلی آتی ہے

حسرتِ دید ترے در پہ شفق کے ہمراہ
تو نے دیکھا ہے، گدایانہ چلی آتی ہے

آپ اپنے سے بنے کیا کہ ٹھنی ہے تجھ بن
آج تک سانس رقیبانہ چلی آتی ہے

اپنے دامن میں چھپائے ہوئے خاکسترِ طور
آرزو دل میں کلیمانہ چلی آتی ہے

مر گیا ہوتا کوئی زیست کے سناٹے میں
اک صدا ہے کہ مسیحانہ چلی آتی ہے

صبح ہے یا کوئی ہمسایہ کی سرگوشی ہے
میرے گھر صورتِ بیگانہ چلی آتی ہے

فصلِ گُل کچھ بھی نہیں ظرفِ گِل وخاک ہے شاذؔ
وہ تو ویرانہ بہ ویرانہ چلی آتی ہے

☆☆

O

اُجالا چھن رہا ہے، روشنی تقسیم ہوتی ہے
تری آواز ہے، یا زندگی تقسیم ہوتی ہے

کبھی ریگِ رواں سے پیاس بُجھ جاتی ہے رہرو کی
کبھی دریا کے ہاتھوں تشنگی تقسیم ہوتی ہے

یہی وہ موڑ ہے اپنے پرائے چھوٹ جاتے ہیں
قریبِ کوئے جاناں گمرہی تقسیم ہوتی ہے

خوشی کے نام پر آنکھوں میں آنسو آہی جاتے ہیں
بقدرِ غم محبت میں خوشی تقسیم ہوتی ہے

یقیں آیا ترے شاداب پیکر کی کھنک سُن کر
بدن کے زاویوں میں یوں ہنسی تقسیم ہوتی ہے

قیامت ہے دلوں کے درمیاں دیوار اُٹھاتے ہو
دِلوں کے درد کی ہمسائیگی تقسیم ہوتی ہے

وہیں کل وقت نے کھائی تھی ٹھوکر یاد ہے اب تک
وہ پیچ و خم جہاں تیری گلی تقسیم ہوتی ہے

سرِ پیہنائے نغمہ شاذؔ کچھ شعلہ سا اٹھتا ہے
سُنا ہے دولتِ پیغمبری تقسیم ہوتی ہے

☆☆

O

سمٹ سمٹ سی گئی تھی زمیں کدھر جاتا
میں اُس کو بھولتا جاتا ہوں ورنہ مَر جاتا

میں اپنی راکھ کریدوں تو تیری یاد آئے
نہ آئی تیری صدا ورنہ میں بکھر جاتا

تری خوشی نے مرا حوصلہ نہیں دیکھا
ارے میں اپنی محبت سے بھی مُکر جاتا

کل اُس کے ساتھ ہی سب راستے روانہ ہوئے
میں آج گھر سے نکلتا تو کس کے گھر جاتا

میں کب سے ہاتھ میں کاسہ لئے کھڑا ہوں شاذؔ
اگر یہ زخم ہی ہوتا تو کب کا بھر جاتا

☆☆

O

ہر لفظ پگھلنے لگتا ہے ہر سانس دُعا ہوجاتی ہے
بے فیض نہیں ہے صحبتِ غم فطرت پہ جلا ہوجاتی ہے

ہم سادہ دلی سے ملتے ہیں دُنیا کے غرورِ بے جا سے
ہر روز یہ دل پچھتاتا ہے، ہر روز خطا ہوجاتی ہے

وہ دن جو شام تک آتا ہے کیا کیا تنکے چنواتا ہے
وہ شب جو سحر تک آتی ہے پچھلے کو بَلا ہو جاتی ہے

کیا شے ہے مسلسل دُوری بھی رنجوری بھی، مجبوری بھی
افسردگیِ جاں قسمت پر راضی بہ رضا ہو جاتی ہے

پیاسے کے قدم لے دریا بھی دیوانے سے لپٹے صحرا بھی
یہ ضد جب پوری ہو نہ سکے شاعر کی اَنا ہو جاتی ہے

جینا بھی حقیقت ہو کہ نہ ہو، مرنا بھی صداقت ہو کہ نہ ہو
اک جُرم ہے ثابت ہو کہ نہ ہو، ہونی ہے سزا ہوجاتی ہے

کچھ اِس کا یقیں ہے شاذؔ مجھے جس شے کو چھولوں بول اُٹھے
تنہائی میں اکثر رات گئے کچھ ایسی فضا ہو جاتی ہے

☆☆

کُتب خانہ

شق ہوا سینۂ گیتی کہ خزینہ نکلے
حکمت و فلسفہ و علم کا زینہ نکلے
ذرّۂ خاک بھی مانندِ نگینہ نکلے
ہر خزف ریزہ یہاں مہر کا سینہ نکلے
ہر سُتوں روشنی و رنگ کا افسانہ ہو
نُورِ خورشید پہ بنیادِ کتب خانہ ہو

○

آنکھ کو زاویۂ فکر و نظر کِس نے دیا
لَب کو اعجازِ مسیحا و خضر کِس نے دیا
ذہن کو جادۂ پُرپیچ و خطر کِس نے دیا
شوق کو حوصلۂ فتحِ قمر کِس نے دیا
ہاں یہیں پرورشِ لوح و قلم ہوتی ہے
کھینچئے قشقہ کہ تعمیرِ صنم ہوتی ہے

○

انوارالعلوم ایوننگ کالج کے کتب خانہ کی تقریب سنگِ بنیاد کے موقع پر

O

علم،ظلمات میں ہے آبِ بقا کے مانند
عِلم،تنویرِ عبادت ہے دُعا کے مانند
عِلم ہے تکملۂ حُسن، ادا کے مانند
عِلم سر تا بقدم نُور، خدا کے مانند
علم جب فکر کی میزان میں تُل جاتا ہے
درِ ہفت آسماں اک آن میں کُھل جاتا ہے

O

عِلم صیقل گرِ اوہام و گماں ہے کہ جو تھا
عِلم،آوازۂ پہنائے زماں ہے کہ جو تھا
عِلم،اندوختۂ دل زدگاں ہے کہ جو تھا
عِلم، تمیزِ مَن و تُو کا بیاں ہے کہ جو تھا
عِلم ہر جادۂ پُرپیچ پہ طاقت ٹھہرے
عِلم گر ہو تو بصارت بھی بصیرت ٹھہرے

O

آگہی چاہیئے اَوراقِ مصوّر ہیں یہاں
ہر ورق آئینۂ شش جہت و سِرّ نہاں
ہر کتاب ایک جہاں دیدۂ بینا کی دُکاں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں الفاظ معانی کے مکاں
تہ نشیں ہو، دُرِ نایاب نکالے کوئی
قطرہ کہتا ہے کہ دریا کو کھنگالے کوئی

O

○

بام و در کہتے ہیں آ، ہم ترا دامن بھر دیں
شرر و شعلہ و سیماب سے تن من بھر دیں
بجلیوں سے ترے احساس کا ایمن بھر دیں
گُلِ تازہ سے تری فکر کا گلشن بھر دیں
طلبِ علم میں اِس در سے سوالی نہ پھرے
جس نے آواز لگائی ہے وہ خالی نہ پھرے

○

انگلیاں بُنتی ہیں وجدان کے بالے کیا کیا
پیاس بھڑکائیں گے امرت کے پیالے کیا کیا
دل کُشا خواب ہیں، تعبیر کے پالے کیا کیا
اِس در و بام میں اُتریں گے اُجالے کیا کیا
وہی تصویریں کہ دیکھا ہے جنھیں خوابوں میں
حُوریں رقصندہ ہیں الہام کی محرابوں میں

○

ہر دریچہ میں ہو یوں شعلۂ ادراک کی لَو
رُخ کو روشن کرے جیسے نگہِ پاک کی لَو
جام میں جیسے ڈھلے خونِ رگِ تاک کی لَو
جیسے فانوسِ بدن میں دلِ صد چاک کی لَو
آگ روشن رہے بُت خانۂ فارس کی طرح
چھونے والا ہو تو ہر سنگ ہے پارس کی طرح

○

○

یہ عمارت رہے اک جلوہ گہِ نازشِ فن
آفریں باد بریں قسمتِ خشت و آہن
دُور تک دیدنی ہے شعلۂ گُل ہائے زمن
سنبل و نسترن و لالہ و ریحان و سمن
آج ہم حوصلۂ سیرِ چمن رکھتے ہیں
آہوؤں کے لئے بُنیادِ ختن رکھتے ہیں

تہذیبِ وفا!

اب بھلا ذکر ہی کیا تیری جُدائی کیا ہے — میں تو روتا ہوں کہ تہذیبِ وفا ختم ہوئی
ڈر رہا ہوں کہ زمیں زیرِ قدم ہے کہ نہیں — جیسے مجھ پر کششِ ارض و سما ختم ہوئی

شورِ دُنیا ہے کہ پرچھائیاں سنّاٹے کی
لب ہلا کرتے ہیں آواز نہیں آتی ہے
جانے کیا ہوگیا دُکھ سُکھ کا مزہ یکساں ہے
جیسے ہر شے مرا معمول ہوئی جاتی ہے
ایک دھاگے سے بندھی ہو مری دُنیا جیسے
کس گراں باریٔ احساس سے تھرّاتی ہے
کون مندر سے چُرالے گیا سب بُت میرے
روح ناقوس کی فریاد پہ گھبراتی ہے
ہائے کس سمت گیا میرا خدا کعبہ سے
پنکھڑی جیسی دُعا بن کھلے مُرجھاتی ہے
آب موتی سے گئی رنگ گُلوں سے چھوٹا
عکسِ آئینہ گیا، دُھوپ کے سائے بدلے
رُخِ مہتاب بُجھا سینۂ شب سرد ہوا
درد چُپ ہوگیا، آہوں کے قرینے بدلے
کتنے خوش رنگ خیالوں کی نقابیں اُتریں
دیکھتے دیکھتے دیکھے ہوئے چہرے بدلے
یہ سزا کیا ہے، جزا کیا ہے، سمجھائے کوئی

کوئی آئے مری قسمت کے نوشتے بدلے
نیک و بد کیا ہے، بھلا کیا ہے ثواب و عصیاں
کیسا ایمان گیا، کیسے عقیدے بدلے

اب بھلا ذکر ہی کیا تیری جدائی کیا ہے — میں تو روتا ہوں کہ تہذیبِ وفا ختم ہوئی
ڈر رہا ہوں کہ زمیں زیرِ قدم ہے کہ نہیں — جیسے مجھ پر کششِ ارض وسما ختم ہوئی

اب یہ طے کر کے چلو!

اب یہ طے کر کے چلو کوئی کسی کا نہ رہے
کوئی پشتارۂ نیکی کہ گناہوں کی کتاب
عرصۂ حشر ہے یہ، صاف رکھیں اپنا حساب
پا برہنہ، نظر افگار، پریشان رہیں
ناقۂ عمرِ دو روزہ کے نگہبان رہیں

O

اب یہ طے کر کے چلو کوئی تمنا نہ رہے
گوشۂ دل یونہی رہتا ہے تو خالی رہ جائے
کسی پتھر کے تلے دستِ سوالی رہ جائے
ہونٹ جلتے رہیں فریاد نہ آنے پائے
اپنی اپنی بھی ہمیں یاد نہ آنے پائے

O

اب یہ طے کر کے چلو صبر کا یارانہ رہے
اپنی تنہائی سے لپٹیں تو کلیجہ پھٹ جائے
کسی غم خوار کو ترسیں تو ترستے ہی رہیں
دشتِ نومیدیٔ جاوید میں سائے کے لئے
ایک دیوار کو ترسیں تو ترستے ہی رہیں

اب یہ طے کر کے چلو کوئی شناسا نہ رہے

درد کے معرکۂ شوق نے دی رُسوائی
بانٹ لیں مالِ غنیمت کی طرح تنہائی
میں رکھوں اشک تمہیں اشکوں کی تابانی دوں
میرے حصّہ میں کھٹکتی ہوئی یادیں رہ جائیں
اور تمہیں زود فراموشی کی آسانی دوں

O

پھر دشتِ وفا لَو دینے لگا بھولے ہوئے غم پھر یاد آئے
جو ریگِ رواں میں ڈوب گئے وہ سارے مسافر یاد آئے

کچھ رنگ تھے ہلکے گہرے سے پرچھائیاں تھیں یا چہرے سے
وہ لوگ نہ جانے اب ہیں کہاں جو تیری خاطر یاد آئے

سنّاٹے کے نوحے سنتا ہوں خاموشی کے ہالے بُنتا ہوں
دیوانوں کی جب بھی یاد آئی ویرانے بظاہر یاد آئے

پھر شام کی پلکیں جُھکنے لگیں میداں کی سانسیں رُکنے لگیں
بستی سے جو واپس آ نہ سکے جنگل کے وہ طائر یاد آئے

اُفتادہ زمیں، قدموں کے نشاں، سُنسان مکاں پچھلے کا دُھواں
شاذؔ اُن کا نہ تھا کچھ ذکر یہاں کس طرح وہ آخر یاد آئے

☆☆

O

پھر ترا درد تری آس کہاں سے لاؤں
ایک نشتر پسِ انفاس کہاں سے لاؤں

تُو زِسر تا بقدم جوُئے خنک آب سہی
زہر سیراب ہوں میں، پیاس کہاں سے لاؤں

ہونٹ جلتے تھے بہ ہنگامِ سخن تیرے حضور
آج وہ شدتِ احساس کہاں سے لاؤں

مجھ سے کچھ مانگنے آئی تھی شبِ رفتہ مری
اب شبِ رفتہ ترے پاس، کہاں سے لاؤں

شاذؔ وہ گمشدگی سب سے جدا سب سے الگ
ہائے وہ سلسلۂ یاس کہاں سے لاؤں

☆☆

O

ہم لاکھ کچھ کہیں بھی تو کیا مانتے ہیں لوگ
یوں کُھل کے مت ملو کہ بُرا مانتے ہیں لوگ

ہر صُبح سب سے پوچھتے پھرتے ہیں ہم کہ آج
بندے ہیں کون ؟ کس کو خدا مانتے ہیں لوگ

دیکھا ہے جن کو خیر سے، گردانتے نہیں
دیکھا جنہیں نہیں ہے، سُنا مانتے ہیں لوگ

اِس دَور میں حیات کا مفہوم جان کر
ناچار ہو کے اپنی خطا مانتے ہیں لوگ

کچھ اِس طرح ہیں ہم بھی، دخیلِ مزاجِ دہر
اک حیلۂ سخن ہے، ذرا مانتے ہیں لوگ

کونپل کے پھوٹنے کی کھنک کیا سُناؤں میں
اس شہر میں تو لُو کو صبا مانتے ہیں لوگ

سمجھے گا کون رُوپ کی جھنکار کیا ہے شاذ
کب رنگ کو فسونِ نوا مانتے ہیں لوگ

☆☆

O

مانا کہ میرے ظرف سے بڑھ کر مجھے نہ دو
شبنم ہی مانگتا ہوں سمندر مجھے نہ دو

جس کو ہوا کے رُخ پہ نہ کھولا گیا کبھی
اک ایسے بادباں کا مقدّر مجھے نہ دو

دیوار جس کی سَرحدِ صحرا سے جا ملے
ایسی سزائے خانۂ بے در مجھے نہ دو

لَو دے رہی ہے سوچ کے وقفہ کی خامشی
ہر بات کا جواب سنبھل کر مجھے نہ دو
کچھ دے سکو اگر تو کوئی خواب سونپ دو
سایہ تلاش کرتا ہوں، پیکر مجھے نہ دو

میں آپ اپنے جرم و سزا کا حریف ہوں
الزامِ شوق سب کے برابر مجھے نہ دو

گر سُن سکو تو شاذ کی خاموشیاں سُنو!
تکلیفِ عرضِ حال مکرّر مجھے نہ دو

☆☆

O

تیرے بغیر صورتِ گردابِ جاں ہوں
اک بادبانِ کشتیِ ریگِ رواں ہوں

اِس زندگی کو ٹوٹ کے چاہا ہے آج
یک طرفہ دوستی سے مگر بد گماں ہوں

کچھ اِس طرح ہے گنجِ سخن میں مری
شبنم کے آئینے پہ سحر کا دھواں ہوں

دستک کی آس، چاپ کا ارماں، اُداسیاں
کوئی خرامِ سایہ کہ خالی مکاں ہوں

میں تشنہ کام شاذؔ سرِ آب کھڑا
اب ریگِ نم پہ قدموں کا جیسے نشاں ہوں

☆☆

O

یہ نیم شب کی نرم آنچ پھول بن سے آئی ہے
سواری ماہتاب کی کِرن کِرن سے آئی ہے

مری نوائے شوق کی یہ دُھوپ چھاؤں دیکھنا
کہ دشت دشت گھوم کر چمن چمن سے آئی ہے

یہ درد و غم کی فُرصتیں یہ عُمر بھر کی خلوتیں
خراب ہو کے زندگی اک انجمن سے آئی ہے

وہ ابتدائے عشق کے تکلفات اُٹھ گئے
وہ آج گھر کے سیدھے سادے پیرہن سے آئی ہے

مرا جمالِ فکر ہے ربوبیت لئے ہوئے
مگر وہ خُوئے سرکشی جو اہرمن سے آئی ہے

سکوتِ شہرِ خواب پر صدا کے زخم آئے ہیں
یہ دھار میرے شعر پر خُلوصِ فن سے آئی ہے

وہ سنگ ہو کہ آدمی ذرا تراش لے کوئی
کہ صنعتِ خیال دستِ تیشہ زن سے آئی ہے

تُو بن چھوئی کلی سہی سُنی ہے جب ہنسی تری
تو نکہتِ وصال تیرے تن بدن سے آئی ہے

دمِ سحر وہ نازنیں ہے شاذ سُرخ و سُرمگیں
شگفتگی یونہی نہیں یہ سب تھکن سے آئی ہے

☆☆

موج و ساحل سے ملو

(دُھن پر لکھا ہوا ایک نغمہ)

موج و ساحل سے ملو
مہِ کامل سے ملو
سب سے مِل آؤ تو اک بار مرے دل سے ملو

دلِ برباد نے کیا ٹوٹ کے چاہا ہے تمھیں
کس قدر پیار سے مرمر کے تراشا ہے تمھیں
جب بھی دیکھا ہے اُسی شوق سے دیکھا ہے تمھیں
سر جھکایا ہے، خُدا مانا ہے، پُوجا ہے تمھیں
رنگ و عشرت سے مِلو
عیش و راحت سے مِلو
نُور و نکہت سے مِلو
سب سے فرصت سے مِلو

سب سے مِل آؤ تو اک بار مرے دل سے مِلو
موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو
تم مرے ہونٹوں پہ رہتی ہو دُعاؤں کی طرح
کتنی معصوم ہو تم میری وفاؤں کی طرح

ہی دور ہو جنگل کی ہواؤں کی طرح
چلی آؤ شرابور گھٹاؤں کی طرح
سبزہ زاروں سے مِلو
نو بہاروں سے مِلو
شوخ دھاروں سے مِلو
تم ہزاروں سے مِلو

سب سے مل آؤ تو اک بار مرے دل سے مِلو
موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو

موجِ مے تم سے چھلکنے کی ادا مانگے ہے
پھول گلشن میں مہکنے کی ادا مانگے ہے
ن آنکھوں سے جھلکنے کی ادا مانگے ہے
درد کا چاند چمکنے کی ادا مانگے ہے
صبح سے شب سے مِلو
پیار سے ڈھب سے مِلو
ناز سے چھب سے مِلو
شوق سے سب سے مِلو

سب سے مل آؤ تو اک بار مرے دل سے ملو
موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو

کیا کہوں دہر میں مجھ سا نہیں تنہا کوئی
تم پہ ظاہر ہے کہ تم سے نہیں پردہ کوئی

تم نہ آوَ تو نہیں میرا سہارا کوئی
آوَ اک بار کرو شاذؔ سے وعدہ کوئی

شبِ رعنا سے مِلو
صبحِ فردا سے مِلو
کیفِ صہبا سے مِلو
ایک دُنیا سے مِلو

سب سے مل آوَ تو اک بار مرے دل سے ملو
موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو

☆☆

ایک سوال

فسردہ شب ہے فلک پر سیاہ بادل ہیں
زمین شفقتِ مادر کا رُوپ دکھلائے
پپوٹے نیند سے ممتا کے جیسے بوجھل ہیں
ادھورے بول لبوں پر سہانی لوری کے
ٹھہرتی جاتی ہے جھولے کی پینگ دھیرے سے
کہ انگلیوں سے سرے چھوٹتے ہیں ڈوری کے
مگر وہ طِفل جو روتا ہے کون سمجھائے

☆☆

پچھلے پہر کی سیڑھیوں سے

پھر پچھلے پہر کی سیڑھیوں سے
اک گیت اُتر رہا ہے دیکھو
پھر زانوئے شاخ شاخ پر چاند
کس ناز سے مُڑ رہا ہے دیکھو

O

پُر شور ہوا، گھٹا، سمندر
دُھنکی ہوئی نَم فضا کا سونا
برفیلی سفید چوٹیوں پر
آہستہ خرام بہہ رہا ہے

O

شفّاف سُنہری وادیوں میں
پھولوں سے ڈھکا ہوا دریچہ
دروازۂ نیم باز کب سے
اک چاپ کا درد سہہ رہا ہے

O

محراب میں آگ جَل رہی ہے
لب بستہ شکستہ وائلن پر
رقصندہ ہیں ناشنیدہ تانیں
یہ شخص ہے کون؟ نام کیا ہے

بکھرے ہوئے بال اُداس آنکھیں
پتھر کا کوئی مجسمہ ہے
اک نغمۂ بے صدا ہے لرزاں
سناٹا یہ کس سے کہہ رہا ہے
اب میرے تمہارے راستے میں
کچھ بھی تو نہیں بجز سمندر
میں پار کہاں اُتر سکوں گا
تم آ نہ سکو گی مجھ تک اُڑ کر
انفاس کا رہ گیا ہے رشتہ
اس جاتی ہوئی بہارِ جاں سے
اک آخری پھول اور چن لو
میں اپنی تمام کشتیوں کو
ساحل پہ جلا رہا ہوں سُن لو

☆☆

O

آباد کب تھا، کیوں اُس نے لوٹا
اِس دل کا کیا ہے ٹوٹا تو ٹوٹا

یا کوئی آنسو دامن پہ ٹپکا
یا کوئی قیدی زنداں سے چھوٹا

ہے کون زیور اُس کے برابر
سادہ لباسی گل ہے نہ بوٹا

میلے میں گم ہے اک طفلِ ارماں
کس کا نہ جانے کب ہاتھ چھوٹا

حالات سچے حالات جھوٹے
کیا حُسن سچا کیا عشق جھوٹا

کیوں شاذ اتنے آزردہ کیوں ہو
آئینہ ٹوٹا یا عکس ٹوٹا

☆☆

O

یوں پاسداریٔ دل زندہ کیا کرو
ہر اک حسین شئے کی تمنا کیا کرو

سونے کی وادیوں کا سفر ہے تمہاری نیند
خوابوں کا انکھڑیوں سے تقاضا کیا کرو

پھولوں کی پتّیوں سے گندھا ہے تمہارا جسم
تم ہر جگہ بہار کا چرچا کیا کرو

اُٹھتے ہیں جن کی ٹیس سے نغماتِ سرمدی
وہ زخم بھر بھی جائیں تو پیدا کیا کرو

کُنجِ سُخن میں اُڑتی ہیں اَن دیکھی تِتلیاں
شامِ خیال و خواب میں پیچھا کیا کرو

سب نرغۂ وجود میں ہیں کیا بچاؤ گے
آپ اپنی زندگی کا تماشہ کیا کرو

اِس آنکھ سے تو صرف قسم کھاؤ پیار کی
اِس منہ سے اور کچھ نہیں وعدہ کیا کرو

توفیقِ عشق شاذؔ بجز آگہی نہیں
ہر رنج سے نشاط کا سودا کیا کرو

☆☆

O

جب میں بھی وہی چاہوں، جب تو بھی وہی چاہے
پھر غم کا سبب کیا ہے، کیوں رونے کو جی چاہے

یادوں کا تقاضا ہے تنہائی کی محفل ہو
محفل کی ہو تنہائی افسردہ دلی چاہے

شکوہ نہ اُلہنا ہے سُنتا ہے نہ کہتا ہے
جو تیری رضا ٹھہرے جو تیری خوشی چاہے

آتش بہ رگِ جاں ہوں، وحشت بہ گریباں ہوں
صحرائے وفا اب تک آہستہ روی چاہے

کیا کیا غمِ دوراں ہے کیا کیا غمِ جاناں ہے
اب اے دلِ تنہا تُو، کِس کِس کی خوشی چاہے

معیارِ وفا اُس نے ہر روز بدل ڈالا
اُس شوخ کا کیا کہنا ہر بات نئی چاہے

جاں تیری محبت کو کچھ اور سوا مانگے
دل تیری مُروّت میں تھوڑی سی کمی چاہے

کیا ہو گیا شاؔذ آخر حیرت ہے کہ یہ تُم ہو
کچھ تو ہے لگی دل کی، کیا دل کی لگی چاہے

☆☆

O

کانپ جاتی ہے دل وجاں کی فضا شام کے بعد
رات کیوں آتی ہے اے میرے خُدا شام کے بعد

ضبط کا حوصلہ پاتے ہیں سحر کے ہمراہ
صبر ہو جاتا ہے پہلو سے جُدا شام کے بعد

زخم روشن نظر آتے ہیں ستاروں کی طرح
کیسی ملتی ہے محبت کی سزا شام کے بعد

کوئی غم خوار کوئی پوچھنے والا ہی نہیں!
ہم بھی ہوجاتے ہیں اپنے سے خفا شام کے بعد

کوئی چھپ چھپ کے بُلاتا ہے ذرا غور سے سُن
دل کے ویرانے سے آتی ہے صَدا شام کے بعد

طاقِ اُمید پہ خاموش ہے وعدہ کا چراغ
دلِ برباد کا کوئی نہ رہا شام کے بعد

شاذؔ پھر اُس سے مُلاقات کی حسرت جاگی
خود بخود ہونٹوں پہ آتی ہے دُعا شام کے بعد

☆☆

O

آج حضورِ یار ہم عرضِ وصال لے چلے
وہم وگماں کی خیر ہو خواب و خیال لے چلے

عکسِ رُخِ بہار ہم آئینۂ نگار ہم
اپنی نگاہ میں ترا حُسن و جمال لے چلے

زخم دِکھانے آج ہم شمع جلانے آج ہم
تجھ کو سُنانے آج ہم صورتِ حال لے چلے

ضبط کیا ہے عُمر بھر کون کرے گا یوں بسر
اپنی مثال ہی نہ تھی اپنی مثال لے چلے

صُبحِ ازل سے شاؔذ ہم مانگ کے لائے شامِ غم
جس کا جواب ہی نہیں ایسا سوال لے چلے

☆☆

O

کوئی گِلہ، کوئی شکوہ ذرا رہے تم سے
یہ آرزو ہے کہ اک سلسلہ رہے تم سے

اب ایک دن کی جُدائی بھی سہہ نہیں سکتے
جُدا رہے ہیں تو برسوں جُدا رہے تم سے

فقط یہ بات کہ تم سے بڑی اُمیدیں ہیں
خفا نہ ہونا اگر ہم خفا رہے تم سے

قدم قدم پہ کوئی آرزو کی راہوں میں
ٹھہر کے اپنا پتہ پُوچھتا رہے تم سے

تمہارے نام سے منسوب ہوگئی ہے غزل
نگارِ فن کا مقدّر بنا رہے تم سے

تمہارے غم سے ہمیں کتنے کام باقی ہیں
تمام عُمر یُونہی جی لگا رہے تم سے

ہر ایک شخص کی ہوتی ہے اپنی مجبوری
میں اُس جگہ ہوں جہاں فاصلہ رہے تم سے

ہمارے عشق کی بُنیاد ہے فراق پہ شاؔذ
خدا کرے کہ یہ نکتہ چھپا رہے تم سے

☆☆

تجدیدِ رسم و راہ

تجدیدِ رسم و راہ کی یہ رُت یہ ابروباد
داغوں کی بھولی بسری چمک یاد آگئی
آنسو کی دُھند، یاد کے جگنو، طویل سوچ
بیتے ہوئے دِنوں کی جھلک یاد آگئی
پہلو میں تھیں دبی ہوئی چوٹیں اُبھر گئیں
ٹوٹے ہوئے دِلوں کی کھنک یاد آگئی
وہ چاؤ وہ سبھاؤ وہ چھل بل وہ رُوپ رنگ
وہ بانکپن وہ نوک پلک یاد آگئی
پیماں کی بیلیں پاؤں سے آکر لپٹ گئیں
وعدوں کے پھول بن کی مہک یاد آگئی

O

اب زینۂ شعور پہ ہم مُدّتوں کے بعد
ہُشیار بن کے یوں ملے نادانیاں گئیں
طے کر کے جیسے بیٹھے ہوں دل کے معاملات
سود و زیاں کی فکر، گراں جانیاں گئیں
اب اپنے اپنے جینے کی ہیں مشکلیں بہت
یادش بخیر مرنے کی آسانیاں گئیں
دل ڈوبتا تھا رخصتِ نجمِ سحر کے ساتھ
پہلی کرن کے دُکھ کی پریشانیاں گئیں

کیا دَور تھا خدا کو مناتے رہے تھے ہم
دل سے دُعا کی بے سر و سامانیاں گئیں

O

اب قربتیں کہ فاصلے زیرِ نگیں تو ہیں
پانے کی آس ہے نہ بچھڑنے کا خوف ہے
اب زخم ہی نہیں تو جراحت کا ذکر کیا
ٹانکا کوئی رہے تو اُدھڑنے کا خوف ہے
کب رُوح کے کھنڈر میں ہے پرچھائیوں کی چاپ
کب دل کی بستیوں کے اُجڑنے کا خوف ہے
اب بازئ وفا میں کوئی ہار جیت کیا
اب کس کو جاں کا کھیل بگڑنے کا خوف ہے
اب اک جہاں کے ناز اُٹھائیں تو کس لئے
پالا کہاں اُمید سے پڑنے کا خوف ہے

O

ہم نے گذار دیں کئی راتیں جُدا جُدا
اَن جانی کب رہی ہیں بدن کی سیاحتیں
تھی لمس کے خیال سے رگ رگ پھنکی ہوئی
ب جزوِ دلبری ہیں لہو کی حرارتیں
ہلو کی آنچ جسم کا تنور، لب کی آگ
ری بھی راحتیں ہیں، تمہاری بھی راحتیں
ب رسمیاتِ رفتہ کا موسم نہیں رہا
ب اعتبارِ درد ہیں اپنی رفاقتیں
ام وصال و ہجر سے بچ کر نکل چلیں
آؤ ہمیں پکار رہی ہیں محبتیں

☆☆

مآل

کل میں تمہارے دَر سے چلا تھا
کیسے کیسے تحفے لے کر
پھول سی باتیں، چھیڑ، لطیفے
شوخ ہنسی، سرگوشی، فقرے
اِدھر اُدھر کے قصّے لے کر
کل میں تمہارے دَر سے چلا تھا

رات ڈھلی، پَو پھوٹ رہی ہے
کیوں یہ اچانک آنکھ کُھلی ہے
گہرے دُکھ کے خیال آتے ہیں
دید کی ساعت وصل کے لمحے
آنسو کیسے بن جاتے ہیں

☆☆

O

تُو، چھوڑ کر ہمیں اِس طرح کل گیا ہے میاں
ہمارا شہر تو کیا دشت جل گیا ہے میاں

ہمیں پتہ ہے کڑی دُھوپ کا سفر کیا ہے
ہمارے سر سے تو سورج بھی ڈھل گیا ہے میاں

ہوائے کُنج میں کچھ بُوئے خوں سی آتی ہے
کوئی تو پھول کی پتّی مَسل گیا ہے میاں

یہ لوگ کون ہیں! یہ بستیاں اُداس ہیں کیوں
یہ کون خاک سی چہروں پہ مَل گیا ہے میاں

نہ ہم ہیں دشت مکیں اور نہ تُو ہے پردہ نشیں
وصال و ہجر کا موسم بدل گیا ہے میاں

بدل سکو تو بدل دو فُغاں کی لَے اپنی
زمانہ دوسری کروٹ بدل گیا ہے میاں

تمہاری پیاس کو شبنم کا آسرا تو مِلا
ہمارے کھیت سے بادل کا دَل گیا ہے میاں

''وہ تم'' کہاں ہے یہ کیوں ''آپ آپ'' کہتے ہو
کہ یہ ''تپاکِ شریفانہ'' کھل گیا ہے میاں

وہ اتنی دُور ہمیں چھوڑ کر گیا، ہی نہ تھا
کہ یوں بھی دُکھ ہے کہ پہلے پہل گیا ہے میاں

چھپائے رکھا تھا اک خواب اپنی آنکھوں میں
گذشتہ رات وہ نیندوں میں جل گیا ہے میاں

وہ اشک تھا، کوئی ارماں تھا، جانے کیا تھا شاذؔ
کھٹک رہا تھا جو کانٹا نکل گیا ہے میاں

☆☆

نذرِ جاں نثار اختر

پچھلے پہر کا سفیر

وہ بکھرے بال، وہ آنکھوں کی سوچتی ہوئی لو
وہ بے نیاز تبسّم تھکی تھکی آواز
میں ڈھونڈھ لاتا اُسے وہ اگر کہیں ہوتا
عجب نہیں وہ پلٹ آئے پھر سے صورتِ راز
میں جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا

O

صدا نہیں ہے، عروس البلاد چُپ کیوں ہے
وہ سیڑھیاں، وہ در و بام سر جھکائے ہوئے
دریچے جیسے سرِ شام لَو بجھائے ہوئے
کسی کے در پہ کوئی نامُراد چُپ کیوں ہے
مکاں پُکارتا شائد اگر مکیں ہوتا

O

تمام شورشِ ہستی سکوت ہے گویا
حیات کچھ نہیں، سناٹا جیسے بات کرے
اِدھر بھی گھور اندھیرا، اُدھر بھی تاریکی
کرے تو بس کوئی ذکرِ توہمات کرے
لگا رہا مجھے کھٹکا تری جُدائی کا
فقط گُماں تھا، گُماں کا کسے یقیں ہوتا

عدم سے تابہ عدم روشنی کے وقفے میں
اَجل اَٹل ہے مگر زندگی کے وقفے میں
دخیلِ ہر نفَسِ آرزو، اَجل کیوں ہے
یہ نوکِ خار قریبِ گلو، اَجل کیوں ہے
الٰہی خیر ہو، کیا قہر کیا تماشہ ہے
یہ تجھ سے پوچھتا، سب کیا ہے تیری ایما ہے
اگر میں خضر و مسیحا کا ہم نشیں ہوتا

O

میں چاروں اور بڑی حسرتوں سے تکتا ہوں
کوئی تو چھب نظر آجائے گی کہیں نہ کہیں
نہ آئینہ میں ترے عکس کی امانت ہے
نہ دائروں میں بھنور کے، تری شباہت ہے
نہ تیرے سائے کا پیکر، تراش سکتا ہوں
تُو سو رہا ہے جہاں خُوش نصیب ہے وہ زمیں
خیال آتا ہے اے کاش میں زمیں ہوتا

جاں نثار اختر کی یاد

☆☆

کوئلیا مت کر پُکار

وہ سُر کی جھیل وہ آواز کے کنول کی دَمک
الاپ تھی کہ کلیجہ کی کور کٹتی تھی
گداز تان میں کومل کی ست رنگی سج دھج
گُلال اڑتا تھا، سینہ میں پَو سی پھٹتی تھی

O

وہ اُنگلیوں کا تسلسل رسیلے تاروں پر
کہ پرَنیاں پہ رواں موتیوں کے فوّارے
طلوع ہوتے ہوئے چاند ہالہ در ہالہ
وہ گنگا جمنی، وہ جِھل مِل وہ ریشمی دھارے
وہ صحنِ جاں کے گلابوں سے رنگ چھنتے ہوئے
وہ کُنجِ رُوح میں شبنم بہ دست انگارے
غزل چھڑے تو کئی چہرے یاد آتے تھے
چلے گئے وہ نگارانِ خوب رُو سارے
ہے محوِ خواب گُلِ نغمہ، زیرِ پردۂ ساز
لبِ خموش پہ سَرگم کے بول گریہ کُناں
دِلوں کے راز کی گرہیں اُلجھتی جاتی ہیں
کہ مِٹ چلا ہے کسی ناخنِ نوا کا نشاں
شکستِ لحن پہ ہے سُرمہ در گلو مضراب
اُداس اُداس ہے لے، نَے سے اُٹھ رہا ہے دُھواں

برہنہ پا ہیں کھرج، تال، سَم، رکھب، گندھار
کھڑی ہوئی ہیں کُھلے سر تمام راگنیاں
ہے آج چرخِ ترنّم سے رخصتِ ناہید
کہ کل سے بند رہے گا سَرسوتی کا مکاں

بیگم اختر کی یاد میں

☆☆

جب نام ترا لیجئے

زمانہ زُود فراموش ہے بہت لیکن
تجھے بھلانے کو رونا پڑے گا برسوں تک
نہ جانے کون سی شئے تھی جسے گنوا بیٹھے
نہ جانے کیا ابھی کھونا پڑے گا برسوں تک
کہا یہ سُن کے مرے غم گسار نے مجھ سے
کوئی بھی زخم ہو بھر جائے گا کبھی نہ کبھی
جو بات آج ہے وہ کل نہیں ہے یادوں میں
چمک چمک کے بجھے گا ہر اک ستارۂ درد
کوئی خلش ہو مُسلسل نہیں ہے یادوں میں

O

بجا، درست، مگر میری بات اور ہی ہے
میرے حبیب کا رنگِ صفات اور ہی ہے

مخدوم کی پہلی برسی پر

☆☆

O

ایسا نہیں کہ لطف و کرم میں کمی رہی
لیکن سحر سے تا بہ سحر بے کلی رہی

آیا ترا خیال تو آنسو نکل پڑے
گر اور جی لئے بھی تو کیا زندگی رہی

کچھ دوستوں کے حُسنِ تغافل کو دیکھ کر
اپنی تو دشمنوں سے بہت دوستی رہی

ہر کام اپنے وقت پہ کرتے رہے مگر
یہ اور بات ہے کہ طبیعت بجھی رہی

پروردگار شدّتِ احساس کے طفیل
ہر سانس ایک مرگِ مُسلسل بنی رہی

ہر اک حسیں خیال پہ تُو یاد آگیا
تیرے بغیر بھی مری محفل سجی رہی

دُنیا کے ہر ستم کی شکایت تم ہی سے ہے
اپنی ہر ایک آس تم ہی سے بندھی رہی

سب میں ہیں اور سب سے جُدا بھی رہے ہیں ہم
حالت ہماری شاذؔ بظاہر چھپی رہی

☆☆

O

موجِ خرام دُور تک رنگ نظر میں بھر گئی
تیری دراز قامتی عُمر دراز کر گئی

راہِ وفا کے موڑ پر دیر سے ہم ملے مگر
تھوڑی سی رہ گئی تو ہے مانا بہت گذر گئی

وہ تو یہیں ہے شہر میں ڈھونڈھتے کیا ہو دہر میں
وحشتِ دل کو کیا کروں لے کے نگر نگر گئی

جی ہے اُداس آنکھ نم ٹوٹ کے رہ گئے ہیں ہم
باقی نہیں کوئی بھرم خاکِ اَنا بکھر گئی

شاذؔ ہماری ہر خوشی اپنی مثال آپ تھی
درد کا ساتھ دے گئی غم سے نباہ کر گئی

☆☆

O

عذابِ ہجر بھی ہے راحتِ وصال کے ساتھ
ملی تو ہیں مجھے خوشیاں مگر ملال کے ساتھ

تمہاری یاد میں بھی ضبط و اعتدال کہاں
میں تم سے کیسے مِلوں ضبط و اعتدال کے ساتھ

یہی بہت ہے زمانہ میں چار دن کے لئے
اگر حیات کٹے ایک ہم خیال کے ساتھ

کچھ اس طرح شبِ مہ نے کرن کی دستک دی
اُبھر گئیں کئی چوٹیں کسی خیال کے ساتھ

اُفق نہیں تو کسی چاند کا تصوّر کیا
ستارے ڈوب گئے درد کے زوال کے ساتھ

شفق، گلال، کلی، چاندنی، الاپ، سحر
نظر کے سامنے آئے تری مثال کے ساتھ

بھٹک رہا ہوں کہ فردا کا راستہ گُم ہے
قدم قدم مرا ماضی ہے میرے حال کے ساتھ

اُسے سُنوں کہ اُسے دیکھتا رہوں اے شاذؔ
جمالِ نغمہ بھی ہے، نغمۂ جمال کے ساتھ

☆☆

O

وہ ایک شخص اگر شہر میں سلامت ہے
ندیم و مُطرب و ساقی کی کیا ضرورت ہے

اب اُس کا ذکر ہی کیا اُس سے کیا شکایت ہے
مری سُنو کہ مجھے عمر بھر کی فُرصت ہے

کبھی تھکے، نہ تھکیں گے کسی کی یاد کے پاؤں
رہِ فراق تو بے منّتِ مسافت ہے

قریب آ، مرے جینے کی مشکلیں کم کر
یہ اقتضائے محبّت نہیں ضرورت ہے

ہم اپنے ناز اُٹھائیں بھلا دماغ کِسے
ہم اپنے آپ سے مِل آئیں کس کو فرصت ہے

اب اور سوچ کے کیوں زندگی اُداس کریں
ہم ایک شہر میں ہیں بس یہی غنیمت ہے

گماں گذرتا ہے مر مر کے جب ملے ہیں ہم
کہ وقتِ دید نہیں ہے یہ وقتِ رخصت ہے

جُدا ہُوں تُجھ سے مگر دُور جا نہیں سکتا
کہ تو وطن میں ہے دل کو سکون و راحت ہے

تُو ماہِ مہر صفت تُو قمر نما خورشید
ترا بدن ہے کہ نکھری ہوئی تمازت ہے

ہے چاندنی شکن آلودہ اور تکیوں پر
گدازِ حلقۂ گیسو کا بارِ نکہت ہے

ستیزہ کار، نصیحت شعار، دل آزار
کہ جانِ شاذ کا یہ رنگ بھی قیامت ہے

☆☆

O

زندگی تیری رفاقت نہ ملی
آئینہ دیکھا تو صورت نہ ملی

ہم نے کیا جنسِ گراں پائی ہے
بیچنے نکلے تو قیمت نہ ملی

تو کہ ہے میری ضرورت جیسے
زندگی حسبِ ضرورت نہ ملی

ایک دُنیا ہے، جسے دُنیا میں
بار پانے کی اجازت نہ ملی

ہم ادھورے نظر آئے کیا کیا
جب ترے ملنے کی صُورت نہ ملی

آج کھولا تھا درِ خانۂ دِل
ایک بھی چیز سلامت نہ ملی

روز ہم قتل ہوئے شاذؔ مگر
خوں بہا کیا کہ شہادت نہ ملی

☆☆

O

زندگی قید ہے، دُنیا در و دیوار لگے
اپنی آواز بھی، زنجیر کی جھنکار لگے

اُس کا ہونا ہی بھری بزم میں ہے وجہِ سکوں
کچھ نہ بولے بھی تو وہ میرا طرفدار لگے

خواب کو چھولیں تو تعبیر کا جادو بولے
سنگ کو ہاتھ لگائیں تو صنم زار لگے

بات کی جھیل میں تو راز کا کنکر پھینکے
کاغذی ناؤ تمنا کی کہیں پار لگے

دل کی دھڑکن پہ قدم رکھتا ہو جس طرح کوئی
راز بُنتی ہوئی جیسے تری رفتار لگے

وہ جو نقصان کے سودے کا مزہ جانتا ہے
لوگ دیوانہ کہیں گے مجھے فنکار لگے

ہم وہ بے بس کہ سرِ معرکۂ عمرِ رواں
پشت ہا پشت کی لٹکی ہوئی تلوار لگے

ہائے اک اہلِ دُکاں سے ہے ندامت کیا کیا
ہم تہی جیب تھے، آنکھوں سے خریدار لگے

کسی خوُبی کا تصوّر ہی نہیں تیرے بغیر
حُسن جس جا نظر آئے ترا کردار لگے

تو وہ سادہ کہ تجھے پیار سکھانا ہوگا
بات ایسی ہو کہ اقرار نہ اِنکار لگے

شاؔذ اب کون کرے پہلے مسیحا کا علاج!
کون پرُساں ہو جب اک عہد ہی بیمار لگے

فون پر

شوخ، شائستہ، شگفتہ رُو، شریر
برق کی لہروں کے ارجُن ویر کی
چٹکیوں میں نیم کش سونے کا تیر

○

زیر و بم میں جیسے ترغیبِ گناہ
بات میں اک نوک سی کھُبتی ہوئی
ریشمیں سیّال، جسمِ صوت پر
لہجگی کی کھونپ سی چُبھتی ہوئی
گفتگو کے لوچ میں جلتے ہوئے
مُرکیوں کے نیلے کا فوری چراغ
کچھ رُکاؤ، کچھ بناؤ، کچھ سبھاؤ
کچھ شفق آلودہ دن چھلکے ایاغ

○

راز اندر راز جانے کون ہے؟
دے رہے ہیں لَو، مرے سینے کے داغ
اجنبی آواز جانے کون ہے؟

☆☆

فصیلِ فراموش گاری سے دیکھو

برستی ہوئی رات، لرزیدہ لمحے، خموشی کی پلکیں جُھکی جا رہی ہیں
فصیلِ فراموش گاری سے دیکھو کہ شمعیں کہیں دُور تھرا رہی ہیں
ہواؤں میں برفاب نشتر چھپے ہیں رگِ جاں میں خوُں منجمد ہو رہا ہے
کوئی دل کے عارض کے آنسو تو پونچھے یہ پاگل ہے کیوں بے سبب رو رہا ہے
گھنے بھیگے باغوں میں کوئل کی کوُ کوُ سُنی اَن سُنی داستاں کہہ رہی ہے
خیالوں کی نبضیں ٹٹولو تو جانو کہ سِیلی ہوئی آگ سی بہہ رہی ہے
وہ یادیں کہ جن کی جبینوں کا لکھا مری راہِ فردا کا سنگِ گراں ہے
مری صبح یا میری شب جل گئی ہے کہ حدِ نظر تک دُھواں ہی دُھواں ہے
وہ یادیں کہ جن پر نقابیں پڑی ہیں نقابوں کو اُلٹو تو چہرے ملیں گے
وہ رنگ اب جو مدّھم نظر آرہے ہیں قریب آ کے دیکھو تو گہرے ملیں گے

○

یہ پچھلے کی خنکی یہ چُپ چاپ منظر، بدن کیا ہے، پرچھائیاں سو رہی ہیں
لَویں روشنی کی صلیبیں اُٹھائے، کھڑی ہیں کہ تنہائیاں سو رہی ہیں
سرِ ریگ زارِ ازل چند پیکر ملے تھے مگر اب نہ جانے کہاں ہیں
ابد کے سمندر کی لہریں گِنو تو ذرا دیکھنا کتنی پرچھائیاں ہیں
کئی بادباں پُرزہ پُرزہ پڑے ہیں نہ اب کشتیاں ہیں نہ پتوار کوئی
کہاں سے چلے تھے کہاں جا رہے ہیں نہیں روئے منزل کے آثار کوئی
وہ سانسوں کے ریلے، تمنا کے میلے کہ ہمراز و ہمزاد تک چھٹ گئے ہیں
فنا کھینچتی ہے، بقا روکتی ہے، کشاکش کی بازی میں سب لُٹ گئے ہیں
اکیلے پرندہ کی آواز گونجی گھٹاؤں میں کوندا سا لہرا رہا ہے
کہیں دُور لفظوں کے زینہ پہ سایہ معانی کا تابوت لے جا رہا ہے

☆☆

O

دُور تک پیچ و خم رنگ نظر پڑتے ہیں
درد کی جھیل میں یادوں کے بھنور پڑتے ہیں

ہم وہ موتی ہیں بہ ہنگامِ سحر گلشن ہیں
جب پروئے نہیں جاتے تو بکھر پڑتے ہیں

بستیاں جاگ رہی ہیں یہ غنیمت جانو
آگے اِس راہ میں سنسان نگر پڑتے ہیں

ہم نے کی سیرِ جہاں راہ میں دیکھا یہ میاں
جن کے دروازے نہیں ہوتے وہ گھر پڑتے ہیں

صرف پرچھائیاں ہیں کس کے خد و خال گنیں
اِدھر آئینے ہیں اور عکس اُدھر پڑتے ہیں

اُن تھکے ہارے پرندوں کا خیال آتا ہے
جو کسی بام پہ ناچار اُتر پڑتے ہیں

شاذؔ درپیش ہے صدیوں کا سفر لمحوں میں
گردِ جادہ کی طرح شام و سحر پڑتے ہیں

☆☆

O

کب چین پڑے اے دل کب درد کو کل آئے
پھر شام ہوئی، گھر سے گھبرا کے نکل آئے

ہم نے بھی یہ چاہا تھا ہنس بول کے رخصت ہوں
جاں تھی کہ تڑپ اُٹھی آنسو تھے نکل آئے

جب کم نظری دیکھی آپ اپنے سے ضد ٹھہری،
وہ خاک جو سونا تھی مٹّی سے بدل آئے

محرومِ نظارہ تھے جب کُنج میں گُل مہکے،
تھے دستِ شکستہ ہم جب شاخ پہ پھل آئے

اے ارض و سما تجھ میں دل بن کے دھڑکتے ہیں
کچھ یونہی نہیں ہم کو آدابِ غزل آئے

فردوس بدر ہو کر پھر سوُئے زمیں لوٹیں!
پھر ساتھ جئیں ہم تم پھر صُبحِ ازل آئے

تعمیر کا شاذؔ اُس دن کیا کیا نہ خیال آیا
جب میرے درِ دل تک تم پہلے پہل آئے

☆☆

O

کچھ عجب آن سے لوگوں میں رہا کرتے تھے
ہم خفا رہ کے بھی آپس میں مِلا کرتے تھے

اتنی تہذیبِ رہ و رسم تو باقی تھی کہ وہ
لاکھ رنجش سہی وعدہ تو وفا کرتے تھے

اُس نے پوچھا تھا کئی بار، مگر کیا کہتے
ہم مزاجاً ہی پریشان رہا کرتے تھے

ختم تھا ہم پہ محبت کا تماشہ گویا
رُوح اور جسم کو ہر روز جُدا کرتے تھے

ایک چُپ چاپ لگن سی تھی ترے بارے میں
لوگ آآ کے سُناتے تھے سُنا کرتے تھے

تیری صُورت سے خدا سے بھی شناسائی تھی
کیسے کیسے ترے ملنے کی دُعا کرتے تھے

اُس کو ہمراہ لئے آتے تھے میری خاطر
میرے غم خوار مرے حق میں بُرا کرتے تھے

زندگی ہم سے ترے ناز اُٹھائے نہ گئے
سانس لینے کی فقط رسم ادا کرتے تھے

ہم برس پڑتے تھے شاذؔ اپنی ہی تنہائی پر
ابر کی طرح کسی در سے اُٹھا کرتے تھے

☆☆

O

مرا ضمیر بہت ہے مجھے سزا کے لئے
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لئے

وہ کشتیاں مری، پتوار جن کے ٹوٹ گئے
وہ باد باں جو ترستے رہے ہوا کے لئے

بس ایک ہوک سی دل سے اُٹھے گھٹا کی طرح
کہ حرف و صوت ضروری نہیں دُعا کے لئے

جہاں میں رہ کے جہاں سے برابری کی یہ چوٹ
اک امتحانِ مسلسل مری اَنا کے لئے

نمیدہ خُو ہے یہ مٹی ہر ایک موسم میں
زمینِ دل ہے ترستی نہیں گھٹا کے لئے

میں تیرا دوست ہوں تو مجھ سے اِس طرح تو نہ مِل
برت یہ رسم کسی صورت آشنا کے لئے

مِلوں گا خاک میں اک روز بیج کے مانند
فنا پکار رہی ہے مجھے بقا کے لئے

مہ و ستارہ و خورشید و چرخِ ہفت اقلیم
یہ اہتمام مرے دستِ نارسا کے لئے

جفا جفا ہی اگر ہے تو رنج کیا ہو شاذؔ
وفا کی پشت پناہی بھی ہو جفا کے لئے

☆☆

O

نئے موسم یونہی آتے رہیں گے
پرانے درد چمکاتے رہیں گے

ہمیں معلوم تھا ہم تجھ سے چھٹ کر
جہاں جائیں گے گھبراتے رہیں گے

گنہ توفیق ہے جس کو عطا ہو
نہیں وہ ہم کہ پچھتاتے رہیں گے

یہ مانا دل کو سمجھانا ہے مشکل
مگر ہم دل کو سمجھاتے رہیں گے

پکارے گی ہمیں منزل مگر ہم
گھنی چھاؤں میں ستاتے رہیں گے

بچھڑ کر پھر ملیں، پھر مل کے بچھڑیں
کہاں تک دل کو سمجھاتے رہیں گے

خبر کیا تھی کہ شورِ زندگی میں
وہ چلتے پھرتے یاد آتے رہیں گے

کہا اُس نے کہ ہم کم کم ملیں شاذؔ
ترس جائیں گے ترساتے رہیں گے

☆☆

O

تمہیں بھی شائد یقیں نہ آئے کہاں کہاں یاد آ گئے تم
کرم کیا، شورشِ جہاں میں اُداس رہنا سِکھا گئے تم

خزاں کا موسم، اُداس گلشن، سکوتِ پیہم، گدازِ شیون
میں برگِ تنہا نہالِ غم پر ہَوا کی مانند آ گئے تم

نہ دل پہ ہے اختیار مجھ کو نہ آنکھ پر اعتبار مجھ کو
میں کیسے مانوں کہ آئے تھے تم اگر گئے ہو تو کیا گئے تم

فِراق کا درد ہے پرانا وصال کا زخم کس نے جانا
میں اپنے آنسو نہ روک پایا کچھ آج اتنا ہنسا گئے تم

گذر رہو کیسا یہ کیا ستم ہے جہاں کی محراب قد سے کم ہے
کہاں گئی شاذ سر بلندی کہاں کہاں سر جھکا گئے تم

☆☆

O

سانسوں میں بسے ہو تم آنکھوں میں چھپا لوں گا
جب چاہوں تمہیں دیکھوں آئینہ بنا لوں گا

یادوں سے کہو میری بالیں سے چلی جائیں
اب اے شبِ تنہائی آرام ذرا لوں گا

رنجش سے جُدائی تک کیا سانحہ گذرا ہے
کیا کیا مجھے دعویٰ تھا جب چاہوں منا لوں گا

تصویرِ خیالی ہے، ہر آنکھ سوالی ہے
دُنیا مجھے کیا دے گی دُنیا سے میں کیا لوں گا

کب لَوٹ کے آؤ گے اِصرار نہیں کرتا
اتنا مرے بس میں ہے میں عُمر گھٹا لوں گا

کیا تُہمتیں دُنیا نے اے شاذؔ اُٹھائی ہیں
اک تہمتِ ہستی تھی، سوچا تھا اُٹھا لوں گا

☆☆

ایرہوسٹس

اُتر کے آئے ہیں ایتھر کی سیڑھیوں سے ہم
غُبارِ نغمہ کی مہکا رہے یمین و یسار
کھنک رہی ہے فضا سُر جگا رہا ہے ستار
وہ دیوداسی کی مانند ہاتھ جوڑے ہوئے
کھڑی ہوئی ہے شفق بر لب و سحر بہ کنار
خفیف سا خمِ گردن سلامِ رخصت پر
خیال آتے ہیں کیا کیا تری مروّت پر
یہ خندہ روئی یہ حُسنِ سلوک یہ نرمی
اے ابر و باد کی بیٹی خلا کی شہزادی
اک التجا ہے بہ وصفِ رفاقتِ کم کم
کوئی تبسمِ پنہاں زمیں کی حالت پر

☆☆

ماورا

مجھے چارہ گر سے خبر ملی
وہ پھر آ گئی یہیں شہر میں
مجھے یوں لگا کہ مرے لئے
کوئی آسرا نہیں شہر میں
مجھے اُس سے کہنا ہے بس یہی
سرِ راہِ شورشِ زندگی
کہ ملے تو آنکھ چُرا نہ لے
کہ جو درد رُوح میں بس گئے
کہ ہم ایک ایک کو جس طرح
پسِ ماہ و سال ترس گئے
یہ وہ غم ہیں ماضی و حال کے
جو نہیں ہیں بس میں وصال کے

☆☆

رائیگاں

کبھی رُت بہار کی گر ملے
کبھی پورے چاند کی رات ہو

گھنے جنگلوں کا سفر ملے
کبھی قبلہ رُخ کی گھٹا اُٹھے

سرِ کشت و خاک کی آس میں
سرِ کوہسار برس پڑے

تو مری وفاؤں کو یاد کر
تو مری دُعاؤں کو یاد کر

☆☆

یاں نَفس واں نکہتِ گُل ہے

مری آواز میں تھا ٹوٹتی راتوں کا سنّاٹا
مرے لہجہ میں جیسے گھُل رہی تھی میری تنہائی

شکستہ ہو رہی تھیں سیڑھیاں خوابیدہ لفظوں کی
معانی تھے سَرِ بامِ سخن گویا تماشائی

تعجب ہے کہ اُس نے میرے اظہارِ تمنّا پر
کوئی حیرت نہ کی چپکے سے باہوں میں سمٹ آئی

☆☆

○

خیال آتے ہی کل شب تجھے بھلانے کا
چراغ بجھ گیا جیسے مرے سرہانے کا

ہیں پتیاں کہ لبِ راز آشنا جیسے
عجب سماں ہے درِ گل کو کھٹ کھٹانے کا

زمانہ راز بہ سینہ ہے، ایسا لگتا ہے
کہ منتظر ہے ابھی تک کسی بہانے کا

تری نگاہ کو ایفائے عہد کہتے ہیں
گِلہ کسی سے کریں کیا ترے نہ آنے کا

قریب سے یہ نظارے بھلے نہیں لگتے
بہت دنوں سے ارادہ ہے دُور جانے کا

یہ کائنات سوالات کا دُھندلکا ہے
جواب مل نہ سکا آج تک ٹھکانے کا

یہ مہر و ماہ بھی پابندِ وقت ہیں لیکن
نہیں ہے وقت کوئی تیرے یاد آنے کا

تمام ارض و سما ہے کلید کی مانند
میں ڈھونڈھتا ہوں درِ گمشدہ خزانے کا

میں اور کوئی بہانہ تلاش کرلوں گا
تو اپنے سَر نہ لے الزام دل دُکھانے کا

چلی ہے رسم و رہِ رنجِ خوش دلی ہم سے
کلیجہ چاہیۓ اپنی ہنسی اڑانے کا

ابھی لبوں پہ تبسم کی راکھ باقی ہے
کھنڈر سے پوچھنا یہ بُت ہے کس زمانے کا

نہ جانے کیوں درو دیوار ہنس پڑے اے شاذؔ
خیال آیا تھا اک روز گھر سجانے کا

☆☆

O

اکثر ترے کوچے سے ہم ہاتھ ملے آئے
اللہ ری مجبوری آنا تھا، چلے آئے

کھینچا ہے ستم ہم نے ڈھالا ہے صنم ہم نے
ہاتھوں کا مقدّر تھا پتھر کے تلے آئے

کیا عمرِ دو روزہ تھی کیا راہ تکی ہم نے
اے دیر شناسا تم، آئے ہو بھلے آئے

ہر خطِ بدن اُس کا دیوانِ نزاکت ہے
کس نوک پلک سے یہ اشعار ڈھلے آئے

اے شاذؔ شب غم سے زینہ پہ شفق کے ہم
رخصت ہوئے رو رو کے مِل مِل کے گلے آئے

☆☆

O

میں حسرتوں کے دوراہے پہ ڈگمگاؤں گا
نہ تجھ کو یاد کروں گا نہ بھول جاؤں گا

تمہی سُناؤ کہ یہ لمحۂ غنیمت ہے
گذر گئی ہے جو مجھ پر وہ پھر سُناؤں گا

وہ اک کھلونا جسے طفلِ آرزو نہ ملا
خبر نہ تھی کہ میں اِس طرح ٹوٹ جاؤں گا

یہ آگہی ہے کسی پیرِ تسمہ پا کی طرح
یہ بار سر سے اتاروں تو سر اُٹھاؤں گا

پہنچ سکے نہ کوئی تشنگی کے دریا تک
میں اپنے نقشِ قدم دور تک مٹاؤں گا

بدن کا عکس تو آئینۂ لباس میں ہے
مگر یہ نکتۂ عریاں کسے سمجھاؤں گا

ہر آشنا سے ہوں بیگانہ کیا قیامت ہے
میں تجھ سے رُوٹھ کے کس کس سے رُوٹھ جاؤں گا

گِلہ نہیں مرے احباب نیک نیت تھے
کہ میں شراب سے دُکھ درد بھول جاؤں گا

مجھے یہ ناز کہ میں تیرے ناز اُٹھاتا ہوں
مجھے یہ زعم کہ میں تیرا دل دُکھاؤں گا

مرا وجود ادھورا ہے جیسے تیرے بغیر
میں تجھ سے چھوٹ کے کس کس سے منہہ چھپاؤں گا

تجھے خبر ہی نہیں کِس قدر حُسین ہے تُو
ہر آئینہ سے سراپا ترا چھپاؤں گا

وہ ایک در جسے دستک کی آس تھی کیا کیا
گماں نہ تھا کہ میں چوکھٹ سے لَوٹ آؤں گا

خفا تھے چہرے کہ آئینہ ساز کیوں ہے شاذؔ
مگر میں باز نہ آیا نہ باز آؤں گا

☆☆

O

جمال و فکر کی تہذیب کا عقیدہ ہوں
تو حُسن ہے میں ترے حُسن کا قصیدہ ہوں

تُو سَیرِ گلشنِ ہستی کرے تو جانے گا
میں برگ برگ پہ تحریرِ چیدہ چیدہ ہوں

اُترتے دیکھے ہیں کتنے چڑھے ہوئے دریا
میں تشنہ کام نہیں ہوں سراب دیدہ ہوں

قیام ہے کہ سفر کچھ پتہ نہیں چلتا
رُکا ہوا ہوں مگر جادۂ رمیدہ ہوں

نہ ہو سکی ہے ملاقات اپنے آپ سے بھی
میں اپنے واسطے اک زہرِ ناچشیدہ ہوں

تری نگاہِ کرم نے مٹا دیا مجھ کو
مری مثال کہ آہِ اثر خریدہ ہوں

کوئی بُرا نہ کہے اُس کشیدہ قامت کو
یہ اور بات کہ میں اِن دنوں کشیدہ ہوں

خدا کے نام پہ جو کاروبار کرتے ہیں
میں رِند ہوں مگر اُن سب سے برگزیدہ ہوں

نہ دیکھ پاؤں گا شاذؔ آنکھ بھر کے دُنیا کو
کوئی نہ چھیڑے کہ میں یوں بھی آب دیدہ ہوں

☆☆

ے

دُکھ دیئے اُس نے بہت اب کے دُکھن اور ہی ہے
مجھ سے مِل کر بھی نہ ملنے کا چلن اور ہی ہے

ہم جو روٹھیں بھی تو منے کے بہانے ڈھونڈھیں
اب کے رنجش میں تو دُوری کی چبھن اور ہی ہے

آمدِ صُبح کو دیکھا ہے دُھندلکے میں مگر
صندلیں رنگ میں یہ سانولا پن اور ہی ہے

یوں بھی کچھ دن کے لئے دُور رہا ہوں تجھ سے
لیکن اِس بار سفر کی یہ تھکن اور ہی ہے

گھر نے سمجھا، نہ اِسے اہلِ وطن نے جانا
میرا گھر اور ہی ہے، میرا وطن اور ہی ہے

سب سے اِس طرح نہ مِل لوگ ہیں خوش فہم بہت
لوگ کیا جانیں کہ اِظہار کا فن اور ہی ہے

میری باتوں پہ تری جنبشِ سر، وقتِ خرام
زُلفِ پابوس کی یہ پینگ یہ گھن اور ہی ہے

تُو بدن ہی نہیں احساس بھی ہے رُوح بھی ہے
سر سے پا تک ترا بے ساختہ پن اور ہی ہے

اب کے چُنِ پایا نہ ماتھے کی شکن بھی اس کی
کیا کہوں شاذ کہ ماتھے کی شکن اور ہی ہے

☆☆

O

شیشۂ دل تھا ترے ہاتھ سے ٹوٹا ہوں ابھی
کوئی آئے مجھے چُن لے کہ میں بکھرا ہوں ابھی

زندگی تُو نے بہت راہ تکی ہے مری
میں کہ اپنے لئے بھُولا ہوا وعدہ ہوں ابھی

عُمر کیا جانے گذرتی ہی چلی جاتی ہے
کس کی امید ہوں کس کس کا تقاضہ ہوں ابھی

فاصلے آج یہ قربت کے سبب سے نکلے
تو مرے ساتھ بھی ہے اور میں تنہا ہوں ابھی

دیکھ کر مجھ کو اُتر جاتے ہیں چہرے کتنے
کتنے چہرے ہیں کہ جن کے لئے پردہ ہوں ابھی

آنکھ لگ جائے تو کس درجہ سکوں ملتا ہے
آنکھ کھلتے ہی یہ احساس کہ زندہ ہوں ابھی

شاذؔ جی میں ہے کہ اپنے سے جُدا ہو جاؤں
کس کو سمجھاؤں کہ تیرے لئے اپنا ہوں ابھی

☆☆

O

میں کہ ہوں تیری رفاقت کے بغیر
جیسے اک سایہ ہو قامت کے بغیر

اتنے برسوں میں یہ پہلی شب ہے
چاند دیکھا تری صورت کے بغیر

تجھ پہ کیا گذری تھی، انکار نہ کر
چار دن میری محبت کے بغیر

روز ملنے کی نہ عادت پڑ جائے
وصل کچھ بھی نہیں فرقت کے بغیر

کون سمجھے گا گناہوں کا ثواب
حُسنِ معصوم کی نیت کے بغیر

یوں لگا بزمِ جہاں میں یارب
میں چلا آیا اجازت کے بغیر

ہم کہ مجنوں بھی تھے فرہاد بھی شاذ
شہر میں پھرتے تھے وحشت کے بغیر

☆☆

O

رات ہے، برسات ہے اور تو بہت یاد آئے ہے
جامِ صہبا سامنے ہے، تشنگی چھلکائے ہے

اُس سے مِل کر بھی وہی عالم نہ مل کر بھی وہی
دل کو جیسے کوئی شعلہ سا لپٹتا جائے ہے

نارسائی کے سبب سے سر گراں رہتے ہیں ہم
آئے دن کی رنجشوں سے جی بہت گھبرائے ہے

رت جگوں کی رُت گئی، بستر لگا تو دیں مگر
نیند کانٹوں کی طرح آنکھوں میں چبھتی جائے ہے

نا خُداؤں کو خُدا توفیقِ بینائی بھی دے
اک سفینہ ہے، بھنور کی گود میں چکرائے ہے

صحنِ گلشن میں اُداسی کا سماں ہے دُور تک
اک پرندہ اُڑ چلا ہے شاخِ گل تھرائے ہے

دل کی وادی میں نشیبوں سے پرے پیچھا پہر
شاذؔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی گاتا جائے ہے

☆☆

O

روز کچھ خواب سہانے ڈھونڈوں
تیرے ملنے کے بہانے ڈھونڈوں

شرط یہ ہے کہ مرا حال نہ سُن
میں تجھے حال سُنانے ڈھونڈوں

اے شبِ غم کوئی غم خوار تو دے
اپنی ہی خیر منانے ڈھونڈوں

دُور تک دشتِ فراموشی ہے
کس خرابے میں خزانے ڈھونڈوں

آپ اپنے سے خفا ہو جاؤں!
آپ اپنے کو منانے ڈھونڈوں

نیم شب کوئی جگاتا ہے ضرور
کیا دھرا ہے کہ سرہانے ڈھونڈوں

آج رونے کو بہت جی چاہے
شاذؔ کچھ دوست پرانے ڈھونڈوں

☆☆

O

یوں بھی ارزاں تو نہ تھے ہوگئے نایاب سے ہم
تو ملا چھوٹ گئے محفلِ احباب سے ہم

کوئی خواہش نہ تمنا نہ شکایت نہ گلہ
سب کو دیکھ آئے اِسی دیدۂ پُر آب سے ہم

کچھ نہ کچھ تیری کمی تو کوئی پوری کرتا
اتنی اُلفت تو نہ رکھتے تھے مئے ناب سے ہم

اپنی تقدیر کے مفہوم سے مانوس ہوئے
تیری تحریر ترے خط ترے القاب سے ہم

بند آنکھوں کی طرح تھا یہ جہانِ بیدار
کوئی تعبیر تو ملتی کہ رہے خواب سے ہم

آمدِ صبح میں تاخیر ہوئی جاتی تھی
روک کر بات کیا کرتے تھے مہتاب سے ہم

شاؔذ جب رات گذر جاتی ہے، یوں لگتا ہے
ایک طوفاں تھا، اُبھر آئے تہہِ آب سے ہم

☆☆

آدھی رات پورا چاند

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے

O

یہ آدھی رات، پورا چاند، آنگن
رمِ آہو، مری عمرِ گریزاں
یہ زخمِ آگہی، یہ شورشِ جاں
یہ وجدانِ نظر، ادراکِ گلشن،
میں شبنم سے شرر کو چھو رہا ہوں
یہ لمحوں کی کشیدہ مئے، یہ بوندیں
زباں کی نوک سے یوں چُو رہا ہوں
رگوں میں چاندنی سی کِھل رہی ہے
مجھے خود اپنی آہٹ مِل رہی ہے
بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے

O

نظارے رفتہ رفتہ کھل رہے ہیں
فضا ہم راز ہوتی جا رہی ہے
کہیں اب آسماں جھکنے لگا ہے
زمیں کافر تھی ایماں لا رہی ہے
گگن اوسر نہیں ہے، بیج بوئیں
کوئی مستقبلِ شاداب کاٹیں

سُنو، فصلِ شعور اب پک چلی ہے
چلو تعبیر لائیں، خواب کاٹیں
مجھے امکاں کی پہنائی ملی ہے
صدا دیتی ہیں سیاروں کی نبضیں
خلاؤں کی مسیحائی مِلی ہے

O

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے
کوئی غم، کوئی ماضی، کوئی افسوں
کسی بے جسم سائے کی صدا ہے
زوالِ عمر ہے یا موت! کیا ہے
کوئی کہہ دے کہ میں گھر پر نہیں ہوں

☆☆

دستِ نارسیدہ

خیالوں کا گھنا جنگل
سوالوں کے ہزاروں ناگ جیسے سرسراتے ہیں
جوابوں کے شکستہ پر پرندے سہمے جاتے ہیں
بقا کے پھل فنا کے پیڑ پر ہوتے ہیں آویزاں
بقا یک سعی دستِ نارسیدہ ہے
زمانہ آب دیدہ ہے

☆☆

ایک روزہ

آج پابندِ صوم تھا یہ حقیر
بارگاہِ خُدا میں سجدہ گذار
عرق آلود، منفعل، نادم
کر رہا تھا گنہ گنہ کا شُمار
اِس طرح تھی مِثال فدوی کی
جیسے بازارِ نقد میں ہو اُدھار
جیسے اک روز عید سے پہلے
کوئی مفلس لئے لباسِ تار
جائے اک نامور خیاط کے پاس
چند ٹانکوں پہ ہو جسے اِصرار

☆☆

زنجیر کی چیخ

سمندر تجھے چھوڑ کر جا رہا ہوں
تو یہ مت سمجھنا
کہ میں تیری موجوں کی زنجیر کی چیخ سے بے خبر ہوں

یہی میں نے سوچا ہے اپنی زمیں کو
اُفق سے پرے یوں بچھا دوں
حدِ این و آں تک اُٹھا دوں
وہ تُو ہو کہ میں
اپنی وُسعت میں لا انتہا ہیں
مگر ہم کناروں کے مارے ہوئے ہیں

☆☆

O

یہ تو ممکن نہیں چُپ چاپ فنا ہوجاؤں
میں تو سناٹا ہوں بکھروں تو صدا ہوجاؤں

جی میں ہے اپنے ہی پہلو سے جُدا ہوجاؤں
رات کٹ جائے تو کیا جانیئے کیا ہوجاؤں

میں وہ مجبور کہ راضی بہ رضا ہوجاؤں
تو اگر بابِ اثر ہے تو دُعا ہوجاؤں

ایک دُنیا مجھے مِل جائے مگر شرط یہ ہے
ایک دُنیا کی نگاہوں میں بُرا ہوجاؤں

تُو محبت ہے زمانے کو ضرورت ہے تری
میں تو اک رسمِ محبت ہوں ادا ہوجاؤں

دشت کا ماجرا کانٹوں کی زباں بن کے کہوں
کُنج میں جاؤں تو پھولوں کی قبا ہوجاؤں

کھینچ دوں چرخِ وفا پر کوئی پَل بھر کی لکیر
کاش ٹوٹے ہوئے تارے کی ضیا ہوجاؤں

دستِ قاتل ہے اُدھر میرا لہو چپ ہے اِدھر
دیکھنا یہ ہے کہ کب روزِ جزا ہوجاؤں

سب خُدا ہیں کوئی انساں تو ملے شاذؔ مجھے
میں تو پتھر بھی نہیں ہوں کہ خُدا ہوجاؤں

☆☆

O

احساسِ وفا جب تم میں نہیں اظہارِ تمنا کس کے لئے
اب روٹھنا منا کیا معنی اب رنجشِ بے جا کس کے لئے

چھیڑے تو کوئی ہم پھوٹ بہیں، کیا کس کی سُنیں کیا کس سے کہیں
آنکھوں کے کھنڈر سے کیا پوچھیں ٹھہرا ہے یہ دریا کس کے لئے

اعزاز تھی کل تک رُسوائی اب ہم ہیں ہماری تنہائی
آئینہ تو ٹھہرا ہرجائی اُترا ہوا چہرا کس کے لئے

کہتے تھے بہت کہنا بھی گیا کیا کیا نہ سہا، سہنا بھی گیا
اک چاند تھا وہ گہنا بھی گیا راتوں کا یہ رونا کس کے لئے

کیا بادِ سمومِ ہجر چلی کیا راکھ ہوئی اک ایک کلی،
شاذ اب بھی ہے کیا وہ در، وہ گلی، باقی ہے وہ رستہ کس کے لئے

☆☆

O

مری فرزانگی بھی ہے جنوں، تُم کیوں نہیں کہتے
میں کس کے واسطے برباد ہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

بھلا اِس طرح کوئی زندگی برباد کرتا ہے
میں اب اِس سے زیادہ کیا کہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

یہ مجبوری، یہ رنجوری یہ دُوری تُم پہ روشن ہے
میں ایسی زندگی کو کیا کروں، تم کیوں نہیں کہتے

نہ رونا ہے نہ ہنسنا جی کا کیسے بوجھ ہلکا ہو
میں روؤں کس طرح کیونکر ہنسوں، تُم کیوں نہیں کہتے

اِدھر میں ہوں، اُدھر دُنیا ہے، کیا کیا کہتی جاتی ہے
تمہارے ہوتے کس کس کی سُنوں، تُم کیوں نہیں کہتے

بُرا کیا ہے اگر تُم مان لو اپنی خطائیں بھی
خطا جب ہو مری، میں تو کہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

وہ اک لمحہ کہ جب مجھ پر وفا کا جُرم ثابت ہو
وہ اک لمحہ کہ جب میں چپ رہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

یہ سچ ہے شاؔذ، ہم اک دوسرے کے غم سے زندہ ہیں
مجھے یہ رنج یہ رازِ دروں، تُم کیوں نہیں کہتے

☆☆

O

ہم آج کوئی سُخن زیرِ لب نہیں رکھتے
توقع اُن سے تو رکھتے تھے اب نہیں رکھتے

کمی نہ ہوگی ضیافت میں چشم و ابرو کی
ہم آئینہ میں ترا عکس کب نہیں رکھتے

بجھادے کوئی، کہ آنکھیں سوال کرتی ہیں
ہمیں یہ وہم کہ دستِ طلب نہیں رکھتے

جبینِ سنگ پہ بھی زخمِ تیشہ آتے ہیں
ذرا سنبھل کہ یہ احساس سب نہیں رکھتے

ہر ایک چیز سے دل اُٹھ گیا ہے شاؔذ اپنا
وہ بے دلی ہے کہ کوئی سبب نہیں رکھتے

☆☆

O

بہت دنوں سے ہے جی میں سوال پوچھوں گا
میں تیرے آئینہ سے تیرا حال پوچھوں گا

بہت حسیں ہے یہ دُنیا مگر زوال کے ساتھ
خدا سے حشر میں حُسنِ زوال پوچھوں گا

سکوتِ شام سے کیوں نسبتِ طبیعت ہے
سکوتِ شام سے وجہِ ملال پوچھوں گا

تُو بے مثال ہے تیری مثال کیا پوچھوں
میں کچھ نہیں مگر اپنی مثال پوچھوں گا

مرا خیال ہے میری نگاہ میں ہے جمال
ترے جمال کا کیا ہے خیال پوچھوں گا

خرابِ عکس ہیں شیشہ بدست کیوں ساقی
قصورِ بادہٴ جامِ سفال پوچھوں گا

فضا اُداس ہے جنگل کی سائیں سائیں ہے شاذؔ
میں کس سے وحشتِ چشمِ غزال پوچھوں گا

☆☆

○

تمام قول قسم تھا، مُکر گیا ہے کوئی
میں رو پڑا ہوں کہ جی سے اُتر گیا ہے کوئی

کبھی کبھی تو ظرافت بھی خوں رُلاتی ہے
ہنسی کی طرح فضا میں بکھر گیا ہے کوئی

نہ اب تو دیں میں کشش رہ گئی نہ دُنیا میں
یہ مجھ پہ آخری احسان کر گیا ہے کوئی

نہیں ہے میزباں جس کا یہ کون مہماں ہے
کھنڈر سی آنکھوں میں آ کر ٹھہر گیا ہے کوئی

میں آپ اپنی کمیں گاہ تھا، شکار بھی تھا
وہ میں تھا یا مرا سایہ تھا، مر گیا ہے کوئی

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا

وہ راستہ تو مرے گھر کا راستہ بھی نہیں
اُدھر سے پچھلے پہر بارہا گذرتا ہوں
یہ احتیاط زمیں پاؤں تھام لے نہ کہیں
کہ رہ نہ جائے کوئی نقشِ پا، گذرتا ہوں
برآمدے سے کہیں روشنی سی چھنتی ہوئی
کرن لجائی ہوئی، دِلبری سی چھنتی ہوئی
چٹکتی جاتی ہے ہر پور جیسے منظر کی
یہ عیشِ دیدۂ پرُ آب ہے، مجھے بس ہے
یہ کیسی آس ہے اب تک، یہ کیسی ڈھارس ہے
کہ جاگتی ہیں ابھی کھڑکیاں ترے گھر کی

☆☆

مُتوسّط طبقہ

مثالِ دستِ کشادہ ہے یہ خُدا کی زمیں

نہ جانے کب سے ہے پہلو میں کشت زار لیے
تمام دوشِ فضا نکہتوں کا بار لیے
یہ ماہتاب کہ گردوں پہ گندنی چھتنار
یہ خنکیاں یہ دھندلکا یہ شہرِ خواب آثار
یہ آفتاب کہ کرنوں کا آبشار لیے
بچھا رہا ہے زرِ روشنی یمین و یسار
ہوا کی موج میں ہے تازگی و برنائی
اُفق سے تابہ اُفق ہے دھنک کی انگڑائی
یہ سیلِ دریا کہ سیرابیوں کا ضامن ہے
برس رہا ہے پیاپے سحابِ گوہر بار
یہ کوہسار ہے نیلم، یہ دشت، معدن ہے

کہ انتظارِ ارادہ ہے یہ خُدا کی زمیں

تماش بیں ہیں، نظارہ شعار ہیں ہم لوگ
ہمیں تو فُرصتِ نظارگی بھی کم کم ہے
ملا ہے جُرعۂ مئے، بے خودی بھی کم کم ہے
گریباں چاک نہیں، بخیہ کار ہیں ہم لوگ
ہمیں تو مہر نے دی ہیں حساب سے کرنیں
ہمیں یہ وہم کہ دستِ طلب نہیں رکھتے

ہم اپنے باب میں سوچیں تو کس طرح سوچیں
یہی سبب ہے کہ کوئی سبب نہیں رکھتے
نہ آستیں پہ لہو ہے نہ داغ دامن پر
بدن فگار نہیں جاں فگار ہیں ہم لوگ
روایتیں ہیں، عقیدے ہیں، دوش و گردن پر
ہمارا پوچھنا کیا وضع دار ہیں ہم لوگ
ہماری رُوح کی عُریانیوں کے مدفن پر
ہمارے تن کا لبادہ ہے یہ خُدا کی زمیں

O

میں لوٹ آؤں کہیں تُو یہ سوچتا ہی نہ ہو
کہ رات دیر گئے تیرا در کھلا ہی نہ ہو

نہیں کہ زیست سے کچھ واسطہ پڑا ہی نہ ہو
میں کیسے مانوں ترا دل کبھی دُکھا ہی نہ ہو

تلاش کر اُسے دیوار و در کے چہروں میں
عجب نہیں تری محفل سے وہ اٹھا ہی نہ ہو

اک اعتمادِ وفا ہے کہ جی رہا ہوں میں
کہ میرے حال کا شائد اُسے پتہ ہی نہ ہو

یہ راستہ تو اُسی در پہ جا کے رُکتا تھا
کہ وہ خفا ہے تو یہ راستہ مُڑا ہی نہ ہو

میں یونہی اُس سے خفا ہوں مگر مجھے ڈر ہے
منانے والا حقیقت میں خود خفا ہی نہ ہو

مجھے تو تُجھ پہ خود اپنا گُماں گذرتا ہے
ترا تھکا ہوا لہجہ مری دُعا ہی نہ ہو

گناہ اور حسین، اہرمن کے بس میں نہیں
ستم ظریف کوئی بندۂ خُدا ہی نہ ہو

میں سوچتا ہوں کہ آپ اپنی دشمنی کیا ہے
مرا وجود مری ذات سے جُدا ہی نہ ہو

بڑے بڑوں کے نشیب و فراز دیکھے ہیں
کوئی ملے تو سہی جس کا سر جھکا ہی نہ ہو

نہ جانے کتنے ہیں سیّارگانِ نادیدہ
تُو انتہا جسے کہتا ہے ابتدا ہی نہ ہو

وہ لاکھ غم سہی ایسا نہیں، یہ دُنیا ہے
کہ شاذ اُس سے بچھڑ کر کبھی ہنسا ہی نہ ہو

O

شکن شکن تری یادیں ہیں میرے بستر کی
غزل کے شعر نہیں کروٹیں ہیں شب بھر کی

پھر آئی رات، مری سانس رُکتی جاتی ہے
سرکتی آتی ہیں دیواریں پھر مرے گھر کی

مجھے تو کرنی پڑی آب یاریِ صحرا
مگر نصیب میں تھی تشنگی سمندر کی

یہ جمع و خرچِ زبانی ہے نقد شعر و سُخن
مگر یہی تو کمائی ہے زندگی بھر کی

اُسی نے بخشی ہے رنگینیٔ حیات مجھے
کبھی کبھی تو اُسی نے حیات دُوبھر کی

ردائے رنگ سے چھنتا ہوا بدن تیرا
یہ چاندنی کہ تمازت ہے تیرے پیکر کی

کتابِ حُسن ہے تو مِل کھُلی کتاب کی طرح
یہی کتاب تو مر مر کے میں نے ازبر کی

صنم کی آس لئے نوکِ تیشہ بوتا ہوں
میں کب سے فصل اُگاتا رہا ہوں پتھر کی

نباہ کرتا ہوں دُنیا سے اِس طرح اے شاؔذ
کہ جیسے دوستی ہو آستین و خنجر کی

☆☆

O

رنجش کے بعد آج ترا سامنا ہے پھر
مایوس ہو چلی تھی طبیعت، یہ کیا ہے پھر

پھر خشت و سنگِ خواب کی زد میں ہے زندگی
گِریہ عمارتِ دل و جاں ڈھا رہا ہے پھر

کس طرح کوئی پرورشِ ہر نَفَس کرے
سمجھا چکے تھے دل کو یہ گھبرا رہا ہے پھر

سُرخی لہو کی آنکھ سے اب تک نہیں گئی
رُک جا، نہ جا اُدھر کہ وہی سلسلہ ہے پھر

اک بار دل دُکھا تھا یہ کافی نہیں ہے کیا
تُو خود یہ کہہ رہا ہے ترا دل دُکھا ہے پھر

کچھ دیر رو بھی لے کہ طبیعت بحال ہو
کیا سوچنے سے فائدہ کیوں سوچتا ہے پھر

یہ عُمر تو سزا کی طرح کٹ رہی ہے شاؔذ
اب اس سزا کے بعد سُنا ہے سزا ہے پھر

☆☆

O

ذرا سی بات تھی، بات آگئی جُدائی تک
ہنسی نے چھوڑ دیا لاکے جگ ہنسائی تک

بھلے سے اب کوئی تیری بھلائی گنوائے
کہ میں نے چاہا تھا تجھ کو تیری برائی تک

تُو چپکے چپکے مُروّت سے کیوں بچھڑتا ہے
مرا غُرور بھی تھا تیری کج ادائی تک

مجھے تو اپنی ندامت کی داد بھی نہ مِلی
میں اُس کے ساتھ رہا اپنی نارسائی تک

اس آئینہ کا تو اب ریزہ ریزہ چُبھتا ہے
یہ آئینہ جسے تکتی رہی خُدائی تک

یہ حادثہ ہے، مرے ضبطِ حال کے ہاتھوں
سفید ہوگئی کاغذ پہ روشنائی تک

پکارتی رہیں آنکھیں چلا گیا ہے کوئی
وہ اک سکوت تھا آواز سے دُہائی تک

نکل کے دیکھا قفس سے تو آنکھ بھر آئی
وہ فصلِ گُل کہ کھڑی تھی مری رہائی تک

غضب ہے ٹوٹ کے چاہا تھا شاذؔ نے جس کو
سُنا یہ رسم بھی تھی صورت آشنائی تک

☆☆

O

کسی کا کوئی ٹھکانہ ہے کوئی ٹھور بھی ہے
یہ زندگی ہے کہیں اِس کا اور چھور بھی ہے

جھلا رہا ہے یہ گہوارہ کون صدیوں سے!
ارے کسی نے یہ دیکھا کہ کوئی ڈور بھی ہے

ہر آدمی ہے یہاں جبر و اختیار کے ساتھ
مگر یہ دیکھ کسی کا کسی پہ زور بھی ہے

سُنے گا کوئی تو پھر کچھ اُسے سنائی نہ دے
کہ ہر سکوت کے پردے میں ایک شور بھی ہے

وہ حسنِ عشق صفت ہے وہ عشقِ حُسن نما
وہ میرا چاند بھی ہے وہ مرا چکور بھی ہے

شکار کر کہ دلوں کہ سُنہرے جنگل میں
ضرور رقص میں بدمست کوئی مور بھی ہے

ہزار جان سے ہم ایک ہیں، یہ سچ ہے، شاذ
رواج و رسم کا لیکن دلوں میں چور بھی ہے

☆☆

ٹائم کیپسول

پہلا باب

مورّخ ـــــ

سُنو خاکِ پروردۂ رامؔ و گوتمؔ
تمہارے شب و روز ہم لکھ رہے ہیں
ہُما کیا زغن کیا کہ جمہوریت ہے
ہر اک چج بہ دستِ قسم لکھ رہے ہیں
نہ پوچھو کہ اس بند مٹھی میں کیا ہے
یہ دیکھو کہ کس کا بھرم لکھ رہے ہیں
نظر میں بُنِ موئے زُلفِ وطن ہے
شکن در شکن، خَم بہ خَم لکھ رہے ہیں
کچھ ایسے خم و پیچ ہیں داستاں کے
کہ ہیں ہاتھ ساکت قلم لکھ رہے ہیں
تمہارے لہو کو حِنا رنگ کہہ کر
جو گذری ہے تم پر وہ کم لکھ رہے ہیں
تضاداتِ دیر و حرم کو چھپا کر
مفاداتِ دیر و حرم لکھ رہے ہیں
کراماتِ اہلِ ستم کو بھلا کر
خُرافاتِ اہلِ کرم لکھ رہے ہیں
صنم کو خُدا مصلحت کہہ رہی ہے

خُدا کو بنامِ صنم لکھ رہے ہیں
ہیں اپنوں کے خنجر سے گردن بُریدہ
پرایوں کے لیکن ستم لکھ رہے ہیں
ہر اک ریگ زار آبشارِ خنک ہے
ہر اک خشک مٹی کو نم لکھ رہے ہیں
بہ ہر سُو معطّر ہے خوشبوئے گندم
کہ آسودگیِ شکم لکھ رہے ہیں
ہمیں سے ہے پاسِ مساواتِ آدم
کہ رہزن کو بھی محترم لکھ رہے ہیں
وجودِ بشر خیر اپنی جگہ پر
مگر ہم بیانِ عدم لکھ رہے ہیں
فسانہ طرازی ہے تاریخ گویا
کہ گردُوں کو زیرِ قدم لکھ رہے ہیں

○

دوسرا باب

ایک سُہانی سحر ——

اور پھر آئی یہاں
ایک سُہانی سحر
ملک کی تقسیم پر
جسم جُدا ہو گئے
روئے زمیں پر مگر
زُلفِ دوتا ہو گئے

چاہا تھا افرنگ نے
خون کے دریا بہیں
شہر ہو سیلابِ خاک
قریہ و صحرا بہیں
وقتِ وداعِ حبیب
اُٹھ نہ سکا شور تک
کتنی براتیں گئیں
دِلّی سے لاہور تک
آنکھ میں ہندو کے نم
دل میں مُسلماں کے غم
سِکھ کا گریباں تھا چاک
ابنِ مسیح آب آب
سب کو جُدائی کا غم
بھائی کو بھائی کا غم
باہیں حمائل کیے
جب وہ چلے، رک پڑے
سوئے زمیں جھک پڑے
ہندو، مُسلماں کے ساتھ
حد ہے کراچی گئے
اور مُسلماں، اِدھر
چھوڑنے ہندو کو آئے
پھر دمِ رخصت وہی
گریہ و زاری کی بات
پھر وہی عہدِ وفا

پھر وہی یاری کی بات
شیر و شکر مُلک مُلک
جنگ کہاں امن تھا
امن بھی امنِ دوام
منہ کے مزہ کے لئے
رنجشِ بے جا بھی تھی
جیسے چلے پَل دو پَل
عاشق و معشوق میں
پھولوں کی چھڑیوں کی مار
خنجرِ ابرو کا وار
پھر وہی کُھل کھیلنا
دردِ بہم جھیلنا

O

تیسرا باب

کہ خوشی سے مر گیا وہ ــــــــ

وہ عصا بہ دست پیکر
وہ برہنہ جسمِ انساں
جسے لوگ کہتے آئے
تھے، مہاتما، پیمبر
وہ تمام عُمر اپنی
پئے نذرِ ہند لایا
اُسے سب نے تاج بخشا

اُسے تخت پر بٹھایا
ہوئے جب رِہا قفس سے
ہوئی ختم جب غلامی
تو وطن کے خال و خد میں
نیا رنگ بھر گیا وہ
ہوئی اس قدر مسرت
کہ خوشی سے مر گیا وہ
یہی ہم نے بھی سُنا ہے
کہ خوشی بڑی بلا ہے
اُسے آنے والی نسلیں
شب و روز اور روئیں
وہ جو بیج اس نے بویا
وہی بیج لوگ بوئیں
(دل دشمناں سلامت دلِ دوستاں نشانہ)

O

چوتھا باب

پانچ ہزار سال بعد ——

صفحۂ وقت رواں، شہرِ خموشاں کی طرح
کون ہیں یہ لوگ یا پرچھائیوں کا رقص ہے
اِن کے پیکر کیا ہوئے کس طرح سائے رہ گئے
کچھ اشارے مٹ چلے ہیں کچھ کنائے رہ گئے
جستجوئے صوت میں حرفِ پریشاں کی طرح

کوئی پیشانی تو ہو جس کی شکن پڑھ پائیں ہم
کوئی چہرہ تو ملے کوئی سَراپا تو ملے
کِس کو دیکھیں جس سے اپنے آپ کو یاد آئیں ہم
آنکھ کے دریا میں اک آنسو کا قطرہ تو ملے
لب کے ساحل پر رُکے کوئی سفینہ لفظ کا
جاں کے گردابوں میں کوئی حشر برپا تو ملے
چھو کے دیکھیں کچھ نہیں شانہ ہلائیں کچھ نہیں
آگے پیچھے چُپ کا مقتل، دائیں بائیں کچھ نہیں

O

پانچواں باب

پانچ ہزار سال بعد کا قاری ——— (الف)

کون تھے وہ لوگ کیا کیا لکھ گیا تاریخ ساز
شہد کے دھارے رواں تھے دودھ کی نہروں کے بیچ
نقرئی رستے، طلائی حاشیے کندن کے پیڑ
لُولُو مرجاں کے فوارے رواں شہروں کے بیچ
کیا فراغت تھی کہ سب محلوں میں رہتے تھے مگر
جھونپڑوں کے خواب کا ارماں نہ نکلا عُمر بھر
مژدۂ آسودہ حالی تھی شکستِ سامراج
خیر کے میداں میں اک دن شر نے بازی ہار دی
اور پھر چاروں طرف سے مُن برستا ہی گیا
نکہتِ گندم سے سارا مُلک بستا ہی گیا

بھوک، فاقہ، خودکشی، مہنگائی، ہڑتال، احتجاج
حاکمِ دوراں نے اِن لفظوں کی گردن مار دی
دولتِ زیرِ زمیں جمہوریت پر وار دی

(ب)

کانچ کے گھر تھے سبھی کے کوئی پتھر ہی نہ تھا
روئی کے گالے ہوں جیسے بات یوں کرتے تھے لوگ
چال مکھن سے ملائم جیسے سرگوشی چلے
اِس قدر پاسِ وطن کے باب میں مرتے تھے لوگ
جب یہ فرمایا گیا ''آرام ہے تم پر حرام''
سب عوام اپنے دل آراموں سے مل کر رو پڑے
اور پھر نعرہ یہ گونجا ''جے جوان وجے کسان''
ہر کساں ہونے لگا آہستہ آہستہ جواں
ہر جواں نے زیرِ لب فرمایا ''حاضر ہے کسان''
جب کہا اُس نے غریبی کو ہٹاؤ ہٹ گئی
دولتِ جمہوریت سب مُفلسوں میں بٹ گئی

(ج)

سیر چشمی، آشتی، آسودگی، زندہ دلی
مذہبی بنیاد پر رسمِ عداوت ہی نہ تھی
سَنکھ مسجد میں بجاتے تھے برہمن رات بھر
اور مندر میں اذانوں پر موذّن رات بھر
کیا زمانے لد گئے کیا ہو گئے یار آشنا
پنڈت احرام آشنا تھے شیخ زُنّار آشنا
سُرخ روئی، زر نصیبی، فربہی، خوش قسمتی

بھیک کا کیا ذکر کاسہ کی روایت ہی نہ تھی
ایک ہی مذہب تھا، بس اِنسانیت، اِنسانیت
وعظ، خطبہ، کیرتن، اشلوک، آیت ہی نہ تھی
رَت جگے منتے، کھنک جاتے تھے سوغاتوں کے تھال
لوگ ہاتھوں میں لئے پھرتے تھے خیراتوں کے تھال

(د)

سب کے مُنہ میں تھیں زبانیں بے زباں کوئی نہ تھا
بولتے تھے اپنی اپنی بولیاں سارے پرند
ایک اُردو تھی کہ جس کا بول بالا تھا بہت
ناز سے پالی گئی جمہوریت کے دور میں
اُس کے شاعر تھے بہت آسودہ حال و مطمئن
جب کوئی اہلِ قلم مرتا تو سارے ملک میں
بند ہو جاتے تھے سب دفتر، دُکانیں، راستے
کیا ہوئی وہ علم و فن کی قدر دانی ہائے ہائے
چھپ گیا زیرِ زمیں گنجِ معانی ہائے ہائے

○

چھٹا باب

حصارِ سنگِ گراں سے آگے ———

حصارِ سنگِ گراں سے آگے
اُدھر زمیں کی تہوں کے نیچے
دَھرا ہے تابوت آگہی کا

فضا میں ہیں گُنگناہٹیں سی
شکستہ لفظوں کی آہٹیں سی
تمام الفاظ چل رہے ہیں
کفن سے باہر نکل رہے ہیں

کسی پرُانے مکاں کے آگے
رُکی ہے لفظوں کی فوج دیکھو
کسی نے پھر کھٹ کھٹایا در کو
چراغ کی سانس رُک رہی ہے
صدا یہ آئی کہ آ بھی جاؤ
کہ کوئی پردہ نہیں رہا ہے
پھٹا پرُانا، ادھورا بستر
کھنکتے ڈبّے، شکستہ برتن
فسردہ بچّے، دریدہ چادر
تمام لفظوں نے چپکے چپکے
کچھ اس طرح ایک دوسرے پر
نگاہ ڈالی کہ سارا منظر
دھوئیں کے بادل میں چھپ گیا ہے

حقیقتوں کے بلند ٹیلوں سے
لفظ نظّارہ کر رہے ہیں
سنہرے کھیتوں میں پھَن کھڑے ہیں
ترازو پاسنگ سے جھکے ہیں
مِلوں کے تالے کراہتے ہیں
درخت کی شاخ میں پھنسی ہیں

وہ گردنیں، جن کی شہ رگوں میں
غیور و خود دار خوں رواں ہے
نظر میں فریادِ آب وناں ہے

قطارِ الفاظ رینگتی ہے
رُکی ہے شیشہ کے گھر کے آگے
سفید بُرّاق ٹوپیوں میں
بڑے بڑے لوگ کرسیوں پر
ڈٹے ہوئے ہیں، سنہری کندن
کے تھال میں ریوڑیاں لگی ہیں
بہ حسبِ منصب جو بٹ رہی ہیں
نگاہیں لفظوں کی جھک چلی ہیں

برہنہ سر لفظ پھر رہے ہیں
نظارۂ نو بہ نو سے ڈر کر
بھنور میں حیرت کے گھر رہے ہیں
قدم قدم ہے گھنا اندھیرا
مسلسل آواز آ رہی ہے
سُنو کہ ہر روز میرے سینہ پہ
گولیاں اب بھی چل رہی ہیں
کہ میرے سینہ کے روزنوں سے
جو کوئی جھانکے تو سیرِ ہندوستاں ملے گی
یہ گل زمیں خوں فشاں ملے گی
مگر مرے ہونٹ ہنس رہے ہیں
مگر مرے ہاتھ اب بھی پرنام کر رہے ہیں

مرا عصا کھو گیا ہے لیکن
مجھے سہارے کی آرزو ہے
مجھے سہارے کی آرزو ہے

اُدھر شوالہ اِدھر ہے مسجد
رواں دواں لفظ کے سپاہی
اُداس ہے رات کی سیاہی
معاً صدائے کرخت آئی
خُدا سے بھگوان کی لڑائی
اُٹھا کے بھگوان سنکھ مسجد کو جا رہا ہے
خدا بھی منبر سے آ رہا ہے
شوالے کی گھنٹیاں پیا پے کھنک رہی ہیں
حرم کی محرابیں تک رہی ہیں
سیاہِ الفاظ سر جھکائے
گذر رہی ہے کہ راستہ پر
سفید چادر میں منہ چھپائے
کوئی شبیہہ، آشنا کی صوُرت
اُداس ہے نقشِ پا کی صوُرت
یہ پوچھتی ہے کہ ٹھہرو ٹھہرو
مرا ٹھکانہ کہاں ہے لفظو
مرا تو کوئی وطن نہیں ہے
یہ کس کے گھر میہمان ہوں میں
سُنا ہے کوئی زبان ہوں میں

اندھیرے رستوں کی خامشی میں
پریشاں الفاظ چل رہے ہیں
مجسّمے دُور شہ نشیں پر
ہزار پہلو بدل رہے ہیں
پھر ایک پتّھر نے یوں پکارا
سُنو، اِدھر آؤ، گنگ لفظو
تم اپنے تابوت سے نکل کر
کہاں چلے ہو، بھٹک رہے ہو
بھلا بتاؤ کہ کون ہوں میں
نہیں — تو پھر اُس مجسّمہ پر
نگاہ ڈالو تو کہہ سکو گے
نہیں — تو پھر اور آگے دیکھو
کئی ہیں، تم کس کو جانتے ہیں؟
نہیں نہیں ہم سے کچھ نہ پوچھو
کہ ہم فقط لفظ ہیں، ہماری
بساط کیا ہے، حیات کیا ہے
اندھیری شب میں ہم اپنا مفہوم ڈھونڈھتے ہیں
تم اپنا مقسوم ڈھونڈھتے ہو
ہم اپنا مقسوم ڈھونڈھتے ہیں

اُداس شب دُکھ پرو رہی ہے
سیاہ وُسعت کے حاشیہ پر
کہیں درختوں کے سبز جھرمٹ میں فاختہ جیسے رو رہی ہے

☆☆

دستِ فرہاد

ترتیب

☆☆

نعت بہ حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

آئینہ دارِ نورِ سراپا تمہیں تو ہو
پردہ خدا نے رکھ لیا، جلوہ تمہیں تو ہو

کیا خوف ہے کہ شعلۂ دوزخ بلند ہے
ہم عاصیوں کی جنّتِ عقبیٰ تمہیں تو ہو

وہ کون ہے جو بڑھ کے خدا کو منائے گا
محشر کے اِس ہجوم میں تنہا تمہیں تو ہو

ہر نامۂ سیاہ کو کملی میں ڈھانپ لو
ہم جس پہ مرمٹے ہیں وہ وعدہ تمہیں تو ہو

کاسہ ہے مختصر اُدھر انعام بحروبر
دامن ہے تنگ دستِ کشادہ تمہیں تو ہو

جن کو کہیں جگہ نہ ملی وہ ہمیں تو ہیں
جس نے ہمیں جگہ دی وہ دُنیا تمہیں تو ہو

احساں کے بعد تم نے نگاہیں جھکا تو لیں
اِس پردۂ حجاب میں آقا تمہیں تو ہو

سچ ہے تمہارا سایۂ پیکر نہ تھا مگر
ہم سر برہنہ کب ہیں کہ سایہ تمہیں تو ہو

روضے کی دید اپنی تمنائے بندگی
بندوں کی کیا خدا کی تمنا تمہیں تو ہو

☆☆

غزل

جی چھوٹ سا گیا ہے کہ کیا کیا نہ چھٹ گیا
دیوانگی تو رہ گئی، ویرانہ چھٹ گیا

ہمراہ تھے حقیقت و افسانہ سُوے دوست
منزل قریب آئی تو افسانہ چھٹ گیا

وہ حسن اپنی ذات سے خود سیرِ حسن تھا
جب وہ صنم چھٹا تو صنم خانہ چھٹ گیا

بیمار اِدھر ہوئے تو اُدھر کوئے ناز میں
شیریں لباں سے کارِ مسیحانہ چھٹ گیا

رِندی چھٹی تو کون سی دُنیا چلی گئی
رونا تو یہ ہے مسلکِ رِندانہ چھٹ گیا

اے میکدے کی اونگھتی شمعو خفا ہو کیا
اے پچھلی رات کیوں ترا یارانہ چھٹ گیا

اپنوں کا رنج دل سے بھلایا تھا جس نے شاذؔ
یہ کیا ہوا کہ آج وہ بیگانہ چھٹ گیا

☆☆

غزل

چشمِ پُر آب میں کچھ یوں ترا پیکر اُترے
جس طرح چاند سمندر میں کھلے سر اُترے

زخم کی طرح یہ سنّاٹا لہو دیتا ہے
کوئی بولے کسی آواز کا نشتر اُترے

مدّتیں گذریں تجھے کھو بھی چکے، رو بھی چکے
لیکن ایک بوجھ سا دل پر ہے یہ کیونکر اُترے

میں تو بس کانپ کے رہ جاتا ہوں، جانے کیا ہو
گر یہی آیتِ غم کوہِ گراں پر اُترے

وہ نہ دیکھیں نہ سہی، ہم تو نظر رکھتے ہیں
کہ ہر اک دوست کے ساغر میں برابر اُترے

اِس نزاکت سے ترے جی سے اُتر جاؤں گا
جس طرح تیرے بدن سے ترا زیور اُترے

شاؔذ اِس دَور کے صحرا میں ہیں یوں شِعر کے پھول
جیسے اُمّت ہی نہ ہو اور پیمبر اُترے

☆☆

غزل

سوزِ دُعا سے سازِ اثر کون لے گیا
اک سنگِ در سے نسبتِ سر کون لے گیا

ہر شئے ہے ناتمام یہ احساس کیوں ہے آج
ہر عیب سے جوازِ ہنر کون لے گیا

کس نے مری نگاہ سے پردے اُٹھا دیئے
اک رنجِ آگہی کہ اُدھر کون لے

عرصہ ہوا کہ پاؤں کے نیچے زمیں نہیں
وہ نقشِ پا وہ راہگذر کون لے گیا

مرے سفینے میرے لہو میں نہا گئے
میرے سراب کے وہ بھنور کون لے گیا

تاخیرِ وقتِ دید تری برہمی کا ڈر
کتنا حسین ڈر تھا وہ ڈر کون لے گیا

حیراں ہے عقل شاؔذ کہ وحشت کِدھر گئی
بستی اُداس ہے کہ کھنڈر کون لے گیا

☆☆

دردِ مشترک

تمہاری ننھی سی معصوم کتنی سیدھی ہے

O

وہ میرے مُنّے سے اِس بات پر الجھتی رہی
تو کوئی کھیل ہو آخر بگاڑتا کیوں ہے
بنا بنا کے لگن سے گھروندے مٹّی کے
مجھے چڑانے کی خاطر اُجاڑتا کیوں ہے

O

خدا کرے کہ تمہیں کوئی بات یاد نہ ہو
کچھ اس طرح کی شکایت تمہیں بھی مجھ سے تھی

☆☆

غزل

شبِ وعدہ کہہ گئی ہے شبِ غم دَراز رکھنا
اِسے میں بھی رَاز رکھوں اِسے تم بھی رَاز رکھنا

یہ ہے خار خار وادی یونہی زخم زخم چلنا
یہ ہے پتھروں کی بستی یونہی دل گداز رکھنا

ہمہ تن جنوں ہوں پھر بھی رہے کچھ تو پردہ داری
کہ بُرا نہیں خرد سے کوئی ساز باز رکھنا

مرے ناخنِ وفا پر کوئی قرض رہ نہ جائے
ترے دل میں جو گرہ ہے اُسے نیم باز رکھنا

وہی لَے جو اَن سُنی بھی وہی شاؔذ نغمگی بھی
یہ حسابِ خامشی بھی مرے نَے نواز رکھنا

☆☆

زمیں کا قرض

زمیں کا قرض ہے ہم سب کے دوش و گردن پر
عجیب قرض ہے یہ قرضِ بے طلب کی طرح

ہمیں ہیں سبزۂ خود رَو، ہمیں ہیں نقشِ قدم
کہ زندگی ہے یہاں موت کے سبب کی طرح

ہر ایک چیز نمایاں، ہر ایک شئے پنہاں
کہ نیم روز کا منظر ہے نیم شب کی طرح

تماشہ گاہِ جہاں عبرت نظارہ ہے
زیاں بدستِ رفاقت کے کار و بار مرے

اُترتی جاتی ہے بام و درِ حیات سے دھوپ
بچھڑتے جاتے ہیں ایک ایک کر کے یار مرے

میں دفن ہوتا چلا ہوں ہر ایک دوست کے ساتھ
کہ شہر شہر ہیں بکھرے ہوئے مزار مرے

☆☆

ترکِ تعلق

پابہ گلِ رات ڈھلے گی نہ سحر آئے گی

کوئی سورج کسی مشرق سے نہ نکلے گا کبھی
ریزہ ریزہ ہوئے مہتاب زمانے گذرے

بجھ گئے وعدۂ موہوم کے سارے جگنو
اب کوئی برق ہی چمکے گی نہ ابر آئے گا

چار سُو گھور اندھیرا ہے، گھنا جنگل ہے
تو کہاں جائے گی پھُنکارتے سناٹے میں

سرحدِ یادِ گذشتہ سے پَرے کچھ بھی نہیں
دیکھ اصرار نہ کر، مان بھی لے، لوٹ بھی جا

میں تری راہ کا پتھر سہی یہ بات تو سُن
آگے کھائی ہے اگر راہ کا پتھر ہٹ جائے

غزل

خوار و رسوا تھے یہاں اہلِ سُخن پہلے بھی
ایسا ہی کچھ تھا زمانے کا چلن پہلے بھی

مدّتوں بعد تجھے دیکھ کے یاد آتا ہے
میں نے سیکھا تھا لہو رونے کا فن پہلے بھی

ہم نے بھی پایا یہاں خِلعتِ سنگ و دشنام
وضعدار ایسے ہی تھے اہلِ وطن پہلے بھی

دلنواز آج بھی ہے نیم نِگاہی تیری
دل شکن تھا ترا بے ساختہ پن پہلے بھی

چاپ خوابوں کی سُنی تھی کوئی آیا نہ گیا
سنسناتا تھا مری نیندوں کا بَن پہلے بھی

آج اس طرح مِلا تو کہ لہو جاگ اُٹھا
یوں تو آتی رہی خوشبوئے بدن پہلے بھی

شاؔذ وہ جانے گا اُن آنکھوں میں کیا کیا کچھ ہے
جس نے دیکھی ہو اُن آنکھوں کی تھکن پہلے بھی

☆☆

غزل

وہ گدا گرانِ جلوہ سرِ رہگذار چپ تھے
جنھیں تجھ سے تھیں اُمیدیں وہ امیدوار چپ تھے

وہ قطار گمرہاں تھی لیئے مشعلیں رواں تھی
وہ جو منزل آشنا تھے وہ پسِ غُبار چپ تھے

یہ عجیب سانحہ تھا جسے چشمِ گل نے دیکھا
کہ طیورِ دام دیدہ سرِ شاخسار چُپ تھے

کسے جراُتِ تسلّی کہ وہ بات ہی تھی ایسی
شبِ انتظار چُپ تھی مرے غمگسار چُپ تھے

ہمیں کم ملیں سزائیں کہ زیادہ تھیں خطائیں
تیرے سہو کیا گنائیں ترے شرمسار چُپ تھے

یہ دل و نظر فگاراں یہی تھے وہ وضعداراں
پسِ کوئے یار گریاں سرِ کوئے یار چُپ تھے

ہوئی ہم پہ سنگ باری مگر اپنی وضعداری
کہ تھی شاذ جن سے یاری وہی اپنے یار چپ تھے

☆☆

غزل

خواب شرمندہ کہ تعبیر دِکھانے سے گئے
سائے سائے مری نیندوں کے سرہانے سے گئے

یوں بھی وہ دل ہو کہ درؔ ہم پہ کھلا رہتا تھا
اپنی اک وضعِ جنوں تھی کہ بہانے سے گئے

راکھ الاؤ کی یہ بکھری ہوئی، جنگل کی یہ شام
کیا زمانے گئے کیا لوگ زمانے سے گئے

کوئی تصویر سَرِآب اٹھاتا ہے بھلا،
اب اُٹھاتے ہو ہمیں کیا کہ اُٹھانے سے گئے

شاؔذ جی عشق میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے
تم ہوئے قیس ہوئے، دونوں ٹھکانے سے گئے

☆☆

استحصال

یہی سر سبز پیڑ ہے کہ جسے
میں نے اپنے لہو سے سینچا تھا

اس پر دان چڑھتی جاتی تھی
جانے کس آرزو سے سینچا تھا

پتہ پتہ پہ میوۂ شاداب
میں نے دیکھا تھا شاخ پر کل تھے

آج سب کچھ چرالیا کس نے
مرے سب پھل تو صبر کے پھل تھے

☆☆

غزل

اُتر آئی بامِ خیال پر ترے رہگذار کی چاندنی
میرے آنسوؤں میں نہا گئی شب انتظار کی چاندنی

ترا انگ انگ ملہار ہے تری پور پور بہار ہے
ترے روپ پر ہے کھلی ہوئی ترے سُر سنگھار کی چاندنی

تری دُوریوں کے پہاڑ پر ترے غم کی برف پگھل چلی
وہ چنار درد کے کیا جلے کہ بجھی چنار کی چاندنی

وہ شگفتہ روئی کہ جس طرح رگِ گُل میں اوس کی آہٹیں
وہ بدن بسنت کی دُھوپ ہے وہ سخن کنوار کی چاندنی

وہی آبِ زر کے سے راستے وہی اشرفی کا سا چاند تھا
مجھے شاذؔ پھر بھی نئی لگی تھی کسی دیار کی چاندنی

☆☆

حُسینؑ

شبِ امتحانِ جاں ہے
یہ گھڑی ہے فیصلے کی
یہ ہے لمحۂ غنیمت
مرے ہمرہانِ منزل
ابھی سوچ لو بھلے کی
ابھی رات درمیان ہے

ㅇ

یہ سفر ہے سیلِ خوں کا
نہیں سر سے تن کا رشتہ
کہ نفس کا تار ٹوٹے
تو سُنائی دے نہ نغمہ
نہ حِنا ہے آبلوں پر
نہ جراحتوں کی پروا
نہیں فکر آب و ناں کی
نہیں ساز و برگِ جادہ
رگِ جاں کا قرض اُترے
کہ لہو کا ہے تقاضہ

O

مری ہمرہی سے پہلے
ذرا سوچ لو رفیقو
کہ شجر نہ سائباں ہے
یہی زیرِ پاز میں ہے
یہی دشتِ آسماں ہے
نہ خرامِ ابرِ باراں
نہ پناہِ نیستاں ہے
شبِ آخرِ وطن میں
شبِ امتحانِ جاں ہے

O

میں ہوں روشنی کا جویا
مجھے روشنی کی دھن ہے
وہی رُوئے آفرینش
وہی روشن جو "کُن" ہے

O

مگر آج اے رفیقو
یہ چراغ سب بجھا دو
جسے عذر ہو سفر سے
رہِ خوف و پرخطر سے
نہ رُکے نہ ڈگمگائے
نہ رِدا میں منہ چھپائے
وہ مری صفِ اثر سے
بخدا سکوں سے جائے

میں کسی کا روئے نادم

بھلا کیسے دیکھ پاؤں

بھلا کیسے دیکھ پاؤں

یہ چراغ سب بُجھا دو

یہ چراغ سب بُجھا دو

☆☆

تین شعر

جب ہمیں دیکھا تو سارے شیشہ گر چُپ ہو گئے
کس طرح ہم اندر اندر ٹوٹ کر چُپ ہو گئے

کیسے کیسے جگ جگے تھے کیسے کیسے چہچہے
ہیں تو گھر والے وہی لیکن وہ گھر چُپ ہو گئے

اک نقاب اُلٹی تھی اُس نے سو نقابیں رہ گئیں
خوش ہوئے اہلِ ہوس، اہلِ نظر چُپ ہو گئے

☆☆

غزل

خراب ہوں کہ جنوں کا چلن ہی ایسا تھا
کہ تیرا حُسن مرا حُسنِ ظن ہی ایسا تھا

ہر ایک ڈوب گیا اپنی اپنی یادوں میں
کہ تیرا ذکر سرِ انجمن ہی ایسا تھا

بہانہ چاہیئے تھا جُوئے شیر و شیریں کا
کوئی سمجھ نہ سکا تیشہ زن ہی ایسا تھا

حدِ ادب سے گریزاں نہ ہوسکا کوئی
کہ سادگی میں ترا بانکپن ہی ایسا تھا

رفاقتوں میں بھی نکلیں رقابتیں کیا کیا
میں کیا کہوں ترا روئے سخن ہی ایسا تھا

جہاں بھی چھاؤں ملی دو گھڑی کو بیٹھ رہے
دیارِ غیر کہاں تھا وطن ہی ایسا تھا

تھی داغ داغ مرے قاتلوں کی خوش پوشی
کہ عمر بھر مرے سر پر کفن ہی ایسا تھا

مجھے تو یوں لگا ترشا ہوا تھا شعلہ کوئی
بدن ہی ایسا تھا کچھ پیرہن ہی ایسا تھا

حقیقتوں میں بھی تھی شاذ رنگ آمیزی
قصیدۂ لب و عارض کا فن ہی ایسا تھا

☆☆

وداع

چلو آج کی رات باتوں میں کاٹیں
ہنسیں، بولیں، گھومیں

O

مجھے آج وہ شام یاد آ رہی ہے
کہ جب ہم ملے تھے
مجھے یوں لگا تھا
کہ میں ایک تہذیب سے آشنا ہو رہا ہوں
اک ایسی زباں
جس کے الفاظ سب اَن سُنے ہیں
مگر جس کا مفہوم پہچانتا ہوں
مجھے یوں لگا تھا کہ میں کوئی اوتار ہوں
ہوائیں مجھے پنکھیاں جھل رہی ہیں
گھنے اَبر سایہ کیے سرنگوں ہیں
کہ میں دھوپ میں چاندنی بانٹتا پھر رہا ہوں
مجھے یوں لگا تھا
کہ میں کوئی سائینس داں ہوں
جو دنیا سے یہ کہہ رہا ہو
سُنو موت پر فتح پالی ہے میں نے

O

چلو آج کی رات باتوں میں کاٹیں
ہنسیں، بولیں، گھومیں
تمھیں تو پتہ ہے
کہ نرگس کو ضد ہے

کہ تم آنکھ کھولو تو وہ آنکھ کھولے
گجر کے پرندے یہی سوچتے ہیں
کہ تم مُنہ سے بولو تو وہ چہچہائیں
ذرا اِن سے مِل لو
تسلّی رہے گی

○

خیالوں کے سنسان جنگل کو دیکھو
یہ کیوں جل رہا ہے
یہ سنّاٹے کیوں رو رہے ہیں
یہ جگنو ہیں یا جیسے شعلے کے پُرزے
ہوائیں درختوں کی باہوں میں کیوں چیختی ہیں
چلو چل کے دیکھیں

○

اُدھر دیکھو گھر ے کے پیچھے
شکستہ عمارت کے اندر
وہ بوڑھا ابھی جی رہا ہے
(جو ماضی ہے اپنا)
چلو اُس سے مِل لیں
کہ پھر اُس کو زندہ نہیں پائیں گے ہم

○

ذرا دیر رُک جائیں الفاظ کی تربتوں پر
معانی جہاں سو رہے ہیں
فراموش گاری کے سبزہ پہ یادوں کی شبنم سے کہہ دو
کہ وہ سوکھ جائے

O

اُدھر جھیل کے نیلگوں آئینہ میں
تمہارے لب و عارض و چشم کا عکس ہوگا
اُٹھالو
اگر وقت کی موج اس کو مٹادے
مجھے رنج ہوگا

O

اُدھر دیکھو ویران مسجد
جہاں ہم خدا سے ملے تھے
خدا یوں بھی تنہا ہے تنہا رہے گا
مگر قہر تنہائی کیا ہے
بھلا کون جانے

O

چلو آج کی رات باتوں میں کاٹیں
ہنسیں بولیں گھومیں
اُدھر شرق کی وادیوں میں
مرا یار ہے چاند
اُس کو پکاریں
کہ وہ اپنی محبوبہ (یعنی تمہاری سہیلی)
جسے چاندنی لوگ کہتے ہیں
ہمراہ لائے کہ محفل سجے گی
اُسے یہ بتادیں
سویرے تم اس شہر کو چھوڑ کر جارہی ہو۔

☆☆

زندگی

کہاں ہے زندگی!
کیا روپ تھا!
کیا ناک نقشہ تھا!
بھلا کیسے بتاؤں گا!
کہ میں اس کا سراپا جانتا کب ہوں
اگر وہ رُو بَرو آئے
تو میں پہچانتا کب ہوں
جو تُم کہتے ہو تارے آویزے ہیں
چاند جوشن، کہکشاں لچکا
شفق ہے مانگ کا جھومر تو سورج آئینہ اُس کا
تمہاری بات سچ ہوگی
مری روداد اتنی ہے
چَرن چھو تا رہا ہوں میں
کوئی پاؤں کا زیور ہو تو دِکھلانا

☆☆

غزل

نیند اُڑا کے وہ مجھے لذتِ خواب دے گئے
پیاس تو چھین لی مری جامِ شراب دے گئے

دشت بچھا گئے ہیں وہ شہر میں دُور دُور تک
تشنہ لبی کے واسطے جوئے سَراب دے گئے

اُن کی عطا کا شکر یہ کیسے کوئی کرے ادا
ظرفِ نظارہ کیا دیا چشمِ پُر آب دے گئے

آئے تھے حاکمانِ شہر قول و قسم لئے ہوئے
چہرے اُتار لے گئے رُوئے نقاب دے گئے

زندگی دُھوپ کا سفر سائے نہ اُترے شاخ سے
شام پڑی تو راستے تھک کے جواب دے گئے

قرضِ وفا کہاں رہا قسطِ کرم ادا ہوئی
اب وہ نہ آئیں گے اِدھر سارا حساب دے گئے

شاؔذ یہ حافظہ کا زخم مرہمِ وقت بے اثر
اُن کا خدا بھلا کرے ایک عذاب دے گئے

☆☆

تن آساں پرندے

میں نے چلتے پھرتے اکثر
گھر کے آنگن کے کونے میں
پنجرے کی رنگیں چڑیوں پر
پیار بھری نظریں ڈالی ہیں
اُڑتی، چہکتی، دھوم مچاتی
جالی کی جدول تک آتی
نارنجی، منیالی، گلابی
کاسنی، نیلی، زرد، سنہری
ایک دھنک سی تن جاتی ہے
چاندنی جیسے چھن جاتی ہے۔

O

آج مری حیرت نے دیکھا
میرے ننھے بیٹے نے
یونہی شرارت سے شاید
پنجرہ کا در کھول دیا ہے
پر سمٹائے سیس جھکائے
ساری چڑیاں سہمی ہوئی ہیں
اُڑنا شاید بھول گئی ہیں

☆☆

غزل

یہ حُسنِ عمرِ دو روزہ تغیرات سے ہے
ثباتِ رنگ اِسی رنگِ بے ثبات سے ہے

پرولیئے مرے آنسو سحر کی کرنوں نے
مگر وہ درد جو پہلو میں پچھلی رات سے ہے

یہ کارخانۂ سود و زیانِ مہر و وفا
نہ تیری جیت سے قائم نہ میری مات سے ہے

مجھے تو فرصتِ سیرِ صفات حُسن نہیں
یہاں جو کام ہے وابستہ تری ذات سے ہے

ہر اک سراب سے چمکا ہے ظرفِ سیرابی
ہر ایک سلسلۂ تشنگی فُرات سے ہے

تعلقات کی گہرائیوں کا اندازہ
خدا گواہ کہ ترکِ تعلقات سے ہے

ہنوز سنگ میں رقصاں ہے جوئے شیرائے شاذ
ہنوز آس کسی تیشہ زن کے ہات سے ہے

☆☆

نوحہ

شامِ غریباں کا دھواں اے کربلا اے کربلا
چاروں طرف ہُو کا سماں اے کربلا اے کربلا

افتاد ہے افتاد ہے، فریاد ہے فریاد ہے
اے آسماں اے آسماں، اے کربلا اے کربلا

وہ مردِ غازی کیا ہوئے وہ اسپِ تازی کیا ہوئے
ڈھونڈھیں کدھر سوچیں کہاں اے کربلا اے کربلا

ہے آبِ تیغِ خوں چکاں بہرِ صفِ تشنہ لباں
دریا بھی ہے ریگِ رواں اے کربلا اے کربلا

ملکِ عدم کے رہرواں بے آسرا بے خانماں
کیسے مکیں کس کا مکاں اے کربلا اے کربلا

آلِ عبا نیزے پہ ہے سورج سوا نیزے پہ ہے
شق ہوگئے سات آسماں اے کربلا اے کربلا

تکمیلِ شست و شو کریں لاشوں کو قبلہ رُو کریں
آتا ہے ہنگامِ اذاں اے کربلا اے کربلا

☆☆

غزل

تم ہر اک کنج کو سوغاتِ صبا دے جانا
میں بھی اک دشت کا ٹکڑا ہوں، گھٹا دے جانا

شاید اس بار وہ در کھول دے باہوں کی طرح
چلتے چلتے ہی سہی اُس کو صدا دے جانا

در گذر کرنا کہ محفل میں ہیں احباب بہت
میں جو خلوت میں مِلوں مجھ کو سزا دے جانا

کوئی سنتا تو نہیں پھر بھی ہیں کچھ لوگ یہاں
دل اگر ٹوٹے تو کہنا کہ صدا دے جانا

بدنِ شعر کی رنگت تو ہے کُندن جیسی
آنے والوں سے بھی کہنا کہ قبا دے جانا

پھر بیاباں تو بنے پھر کوئی صحرا تو سجے
آگ جنگل میں لگی ہو تو ہوا دے جانا

میں تو یہ جشنِ جُدائی بھی مناؤں ہنس کر
تم بس اک فرصتِ غم مجھ کو ذرا دے جانا

ہم بتوں کے لئے دن رات ہیں قشقہ بہ جبیں
ہم فقیروں کو بھی کچھ بہرِ خدا دے جانا

جب کہیں حُسن مِلا ہم نے پرستش کی ہے
اپنا منصب ہے حسینوں کو دُعا دے جانا

کیا بڑی بات ہے اے دستِ ہنر ترے لئے
آئینہ کی طرح مٹی کو جِلا دے جانا

ہم نے اِس راہ کو ہموار کیا ہے برسوں
تم جب اِس راہ سے گذرو تو دعا دے جانا

اِس چمن میں کوئی زخموں کو دِکھائے کیا شاذؔ
اَے نسیمِ سحری اپنا پتہ دے جانا

☆☆

غزل

حصارِ شہر مِلا، دشت کا مزہ نہ مِلا
جنوں کے دَور میں بھی کوئی مشغلہ نہ مِلا

اب اُس گلاب نے کانٹے کی اِک چُبھن بھی نہ دی
مِلا ضرور وہ مجھ سے مگر خفا نہ مِلا

نہ تیرے قد کی کوئی بحرِ خوش خرام مِلی
غزل کا ذکر ہی کیا کوئی قافیہ نہ مِلا

جو بس چلے تو وہ سمٹا لے ہر نموئے بدن
حیا سے اپنی کوئی یوں تھکا ہُوا نہ مِلا

بھنور کی چیخ بُلاتی رہی مگر اے شاذؔ
اندھیری رات تھی موجوں کا نقشِ پا نہ مِلا

چھٹا آدمی

یہ مرا شہر ہے
خوبصورت، حسیں
چاندنی کا نگر، دھوپ کی سرزمیں
شہر کے روز و شب میری آنکھیں
جس طرح پتلیاں اور سفیدی
میں ان آنکھوں سے سب منظرِ رنگ و بُو دیکھتا ہوں
راستہ راستہ، کُو بہ کُو دیکھتا ہوں

○

میں کہ شب گرد شاعر
چاند سے باتیں کرتے ہوئے چل پڑا تھا
ایک بستی مِلی
ملگجے اور سیہ جھونپڑے چار سُو
جھونپڑے جنکی شمعوں میں سانسیں نہ تھیں
زرد بیمار اُجالے
راکھ اور گندگی

اک عفونت کا انبار
زندگی جیسے شرما رہی تھی

○

مری جانب کہیں دُور سے ایک سایہ بڑھا

میں نے پوچھا کہ تم کون ہو!
وہ یہ کہنے لگا
میں کہ ظلمت ہوں ——— تم روشنی دو مجھے
میں جہالت ہوں ——— تم آگہی دو مجھے
میں نجاست ہوں ——— پاکیزگی دو مجھے
لوسنو اور دیکھو مجھے

میں چھٹا آدمی ہوں بچالو مجھے
میں چھٹا آدمی ہوں بچالو مجھے

☆☆

ایک سوچ، ایک سوال

یہ شام، شامِ غریباں ہے، بے سر و ساماں
یہ شہر اپنی صلیبِ سکوت اُٹھائے ہوئے
عمارتیں ہیں کہ کتبوں کی طرح استادہ
تمام راستے نقشِ قدم مِٹائے ہوئے
کہاں گئے مرے خنجر بکف وطن والے
ہزار مرحلۂ خوں فِشاں تو باقی ہے
زمیں ہے سُرخ تو کیا، آسماں تو باقی
یہ چاند کس کا ہے، سورج ہے مِلکیت کس کی
ہوائیں کس کی ہیں، تاروں کا جال کیسا ہے
عجب نہیں ہے کہ اِن کا بھی کوئی مذہب ہو
تو پھر ہو خون خرابہ، خیال کیسا ہے

☆☆

اداس شام

اُداس شام تھی بادل گھنے گھنیرے تھے
گگن تمام تھا سرمہ کے سائباں کی طرح
ٹھہر کے رہ گئی تھی دونوں وقت کی میزان
کہ لگ رہا تھا کہ سناٹے تلتے جاتے ہیں
ہوائیں سرد تھیں، دھندلاہٹوں کی خنکی میں
کوئی سبب تو نہ تھا یونہی جی بھر آنے لگا
(کہ جیسے زرد قمر ڈوبتا ہو دریا میں)

O

تمہارے پاس بڑی آس لے کے آیا تھا
کہ منہ سے کچھ نہیں بولوں گا اور رولوں گا
تمہیں تو دیکھ کے بس چُپ سی لگ گئی ہے مجھے
تمہاری آنکھیں تو پہلے سے سُرخ لگتی ہیں

☆☆

آب وسَراب

تو یہ چہرہ ہے وہی دیکھ کے جس کو اکثر
سیرچشمی کا ہوا کرتا تھا احساس مجھے
تو یہ باتیں ہیں وہی راز کی گرہیں تھیں کبھی
تو یہ وہ ہے جو سمجھتی تھی بہت پاس مجھے
تو یہ آنکھیں ہیں وہی بوسۂ لب کے ہنگام
بند ہو جاتی تھیں مندر کے کواڑوں کی طرح
تو یہ باہیں مری دیوارِ بدن کا تھیں حصار
رات بھر میں جو پگھل جاتی تھیں شمعوں کی طرح

○

مدّتوں بعد نہ جانے اُسے کیا یاد آیا
بے ارادہ وہ چلی آئی تھی یونہی سرِ شام
وہی لہجہ تھا مگر اگلی سی وہ کاٹ نہ تھی
وہی تہذیب تھی باقی وہی شائستہ سلام
چٹکیوں میں لئے مہکے ہوئے پلّو کی لپیٹ
یوں، کہ سُن گُن بھی نہ دے پیچ وخمِ پائے خرام
اب ہنسی کیا تھی تبسّم کی خوش اخلاقی تھی
دل بھی ٹوٹے نہ مرا، بات بھی رہ جائے مری
اس مُروّت میں بھی پرُکاری ابھی باقی تھی

○

وہ گرہستی کی سناتی رہی رُوداد اپنی
وہی بچّوں کی شرارت وہی گھر کے دن رات
وہی آیا، وہی باورچی کا چونچال مزاج
وہی مہنگائی کا دُکھڑا وہی پٹرول کی بات
وہی فلموں کی للک تھی وہی اتوار کی آس
وہی دفتر کی شکایت، وہی شوہر کے صفات

O

اب مرے پاس تو موضوعِ سخن کچھ بھی نہ تھا
راہِ ظلمات میں آوارہ سِکندر، جیسے،
سوچتا تھا کہ میں کیا ہوں، مجھے کیا ہونا تھا
دستِ بُت گر میں تغافل زدہ پتھر جیسے

O

وہ اچانک اُٹھی، آداب کیا، جانے لگی
پائے رقص آلودہ سے اٹھلاتی تھی طاؤس کی چال
ایک کیفیت بے نام تھی طاری مجھ پر
میرا یہ حال کہ آنسو نہ تبسم نہ ملال
بے در و بام مکاں ہو گیا اب میرا وجود
کوئی آئے، کوئی جائے، نہیں دستک کا سوال

☆☆

درگذر

کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے
پھینک آئے تھے مجھے یوسفِ کنعاں کی طرح
کھینچ لائے تھے مجھے شہر کے بازاروں میں
سب کو دِکھلاتے تھے آئینہ حیراں کی طرح
لوگ کہتے ہیں کہ کوئی بھی خریدار نہ تھا
کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے
چھوڑ آئے تھے سلگتے ہوئے میداں میں مجھے
ایڑیاں رگڑیں مگر چشمۂ زمزم نہ ملا
کیسے تنہا کیا کس حالِ پریشاں میں مجھے
کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے

O

باغِ آسائش ہستی بھی دکھایا مجھ کو
کوئی شدّاد نما تھا کوئی نمرود صفت
بے گناہی کی سزا تھی کہ وہ سچ کا انعام
رسن و دار کے منبر پہ بٹھایا مجھ کو

O

کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے
کوئی انسان، کوئی شیطاں، کوئی چہرہ، کوئی نام
حافظہ شیشہ کی مانند دَرک جاتا ہے

اے خدا تجھ سے تو پوشیدہ نہیں ہے کوئی راز
دوست ہوں گے کہ وہ دشمن مرا پہنچا دے سلام
شکر کرتا ہوں کہ دُنیا کے خزانے نے مجھے
کوئی موتی نہ سہی، آنکھ تو گریاں دی ہے
کیا دیا، کیا نہ دیا، تو نے خدائے فیاض
کیا یہ کم ہے کہ مجھے دولتِ نسیاں دی ہے

☆☆

سَنگ آباد کی ایک دُکاں

سَنگ آباد میں کیا میں نے دُکاں کھولی ہے
لوگ حیرت زدہ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں
اک خریدار نے پوچھا کہ یہ سب کیا! تو زباں کھولی ہے
یہ ہے قرنوں سے کھڑا سوچ کی آواز کا بُت
کوئی وجدان کا موسم کوئی الہام کی رُت
جب بھی آئے گی یہ دے گا کوئی نادیدہ سُراغ
آپ اِدھر آنکھ اُٹھائیں تو دکھائی دے گا

شیشۂ لمحہ ہے یہ جس میں ہے صدیوں کی شراب
سانس کے گملوں میں یہ عمرِ دو روزہ کے گلاب
جھاڑ فانوس ہیں تخئیل کے روشن ہیں چراغ
آندھیاں آئیں تو یہ آنکھ مِلا کرتے ہیں
روغنِ فکر کی حدّت سے جَلا کرتے ہیں
غور سے دیکھیے کیا کیا نہ سجھائی دے گا

در و دیوار پہ پیشانیاں، زخم آلودہ
سجدے محرابوں میں آرامیدہ و آسودہ
کانچ کا طاق ہے یہ، جس میں ہے ارماں کی قطار
یہ جو الفاظ کھلونوں کی طرح ہیں ان کی
چابیاں رَت نئے مفہوم کی مِلتی ہیں ہزار
یہ ہے احساس کا گُلداں کہ ہیں کلیاں جس میں

جب یہ چٹکیں تو چھٹی جس کی ضرورت ہوگی
یہ وہ تصویر ہے آنکھوں کی زباں ہو جس کی
وہ پڑھے گا جسے توفیقِ بصیرت ہوگی
نا فریدہ ہے یہ دُنیا مگر اک خاکہ ہے
خیر و شر ہوں گے مگر صورتِ حالات جُدا
نیک و بد کی نئی فرہنگ مرتب ہوگی
رُوز و شب ہوں گے یہی صبح الگ رات جدا
کیا کہا آپ نے وہ کون ہے! پتھّر کی طرح
وہ کوئی جنس نہیں ہے کہ جو بیچی جائے
عکسِ زندہ ہے وہ میرا، نہ کوئی چھو پائے
وہ اِسی آس پہ جیتا ہے یہ سب بکھرائے
کوئی گاہک اِدھر آئے گا پیمبر کی طرح

☆☆

کُہرام

وہ بستیاں کہ ہمالہ تری دہائی ہے
تمام دیوتا خاموش، سَر جھکائے ہوئے

ہزار راکھشسوں کی ہنسی کا ہے کُہرام
ہزار ناگ نکل آئے، پھَن اٹھائے ہوئے

کسک، کراہ، تپک، آگ، گھاؤ، چیخ، پُکار
یہ شور ہے کہ پچھل پیریوں کی ہے جھانجھن

کٹیلے دانتوں سے رِستی ہیں خون کی بوندیں
نکیلے ناخنوں سے رقص میں یہ کنچن

کمر کمر ہے جوالا، گلی گلی لاوا
اذاں کی گونج رُندھی ہے، بکھر گئی سمرن

لہو سفید ہے لیکن یہ ماں کا دودھ نہیں
یہ چور وہ ہیں چراتے نہیں ہیں جو ماکھن

کہاں ہے وِس کا پیالہ کہاں ہے امرت رس
ہتھیلیوں پہ لیئے آئے کوئی تن من دھن

ترس رہی ہے نئے نیل کنٹھ کو دھرتی
خبر نہ تھی کہ سمندر کا تھا یہی منتھن

☆☆

ہم لوگ

رُوز دُنیا کو تکا کرتے ہیں ہم حیرت سے
نغمے سُن سُن کے دُھنا کرتے ہیں سر بہرے بھی
خضر کے بھیس میں ملتے ہیں کئی اندھے بھی
پانی پانی ہیں سیاست سے ادب تک کے نِکات
کیا رواں بولتے ہیں سحر بیاں گونگے بھی

O

ریس کے گھوڑے ہیں یا تاش کے پتے ہم لوگ
جانے اب کیا ہو سہم جاتے ہیں دل دہشت سے
کیسے کیسے ہیں پسینے کی کمائی والے
کاجل آنکھوں کا چرا جاتے ہیں کس محنت سے
محنتانہ تو ہے سونے کا نوالہ جیسے
کون احمق ہے جو منہ موڑتا ہو رشوت سے
لکشمی دیوی کو ہر اک کا پتہ کیا معلوم
کیوں نہ اک روز پہنچ جائیں ہمیں فرصت سے

☆☆

ایک راز

ہم ہیں اور شہر میں ہم سے ہیں کئی آوارہ
جن کی پرواز میں حائل ہیں پَر و بال بہت

اُس کے کوٹھے پہ فردا ہے طوائف کی طرح
ہم کہ نغمہ بھی نہ سُن پائیں تو سُرتال بہت

ہم نِرت بھاؤ کے سَودے کو بھلا کیا جانیں
سیڑھیاں چڑھیے تو ہر گام پہ دَلاّل بہت

کچھ ہمیں جانتے ہیں اپنی گرہ میں کیا ہے
کیسے کھولیں ابھی ناخن کے ہیں احوال بہت

خاکستر و شرر

جب ترکِ وفا کا زرد موسم
سناٹے دِلوں میں بو رہا تھا
شاخوں سے اُتر چلا تھا زیور
سُوکھے ہوئے، سر برہنہ، پتے
لمحات کی طرح اُڑ رہے تھے
جب اگلے برس بہار کی آس
باقی نہ رہی تو رو پڑی وہ
کچھ اپنے نصیب کا تھا شکوہ
کچھ برہمی اپنے آپ سے تھی
در اصل تھا مجھ پہ سارا غصہ

○

مِلنا نہ دُعا سلام لیکن
تصویروں، خطوں کا تھا تقاضہ
خفگی بھی تھی، ضِد بھی، بے بسی بھی
رسوائی کا خوف اُس کے دل میں
فتنوں کو جگا رہا تھا جیسے
بدنامی کے ڈر سے اُس کے رخ پر
کچھ ابر سا چھا رہا تھا جیسے

میں نے بھی یہ سوچ کر اب اس کو
کب مجھ پہ بھروسہ رہ گیا ہے
تصویروں، خطوں کی یادگاریں
سونپیں، تو وہ چونک اٹھی
آنکھوں کی زباں سے کہہ رہی تھی
تم سے تو نہ تھی مجھے یہ امید
کیوں، اتنے کٹھور ہوگئے شاذ

☆☆

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

نظّارے دے رہے ہیں لہو، جانتا ہے کون
الزام سارے میری نگاہوں پہ آئے ہیں

کتنے مہیب چہرے ہیں یوسف بنے ہوئے
کیسے فریبِ چشمِ زلیخا نے کھائے ہیں

ممسک کے ہاتھ میں ہیں خزانہ کی چابیاں
کتنے غنی ہیں کاسہ بکف در پر آئے ہیں

ظلماتِ بیکراں ہے تو جگنو ہے حکمراں
شب زندہ دار کتنے دیئے جھلمائے ہیں

موتی ہیں چور چور خزف، شمعِ کوہِ طور
کیا آسماں تھے کس نے زمیں پر بچھائے ہیں

مسند پہ ناگ بانبی میں منتر ہے مضطرب
کس بین سے سپیروں نے جادو جگائے ہیں

ترتیبِ دہر و نظمِ جہاں دیکھتا ہوں میں
شاید مرے خدا نے بھی قُرعے اُٹھائے ہیں

☆☆

غزل

ملتا ہے وہ اجنبی ہو جیسے — بیزار سپردگی ہو جیسے
میرا یہ سکونِ غم کہ اُس کو — بھولا تو نہیں خوشی ہو جیسے
سبزہ پہ ہیں قتلِ گل کی چھینٹیں — اک فصل کی خودکشی ہو جیسے
وہ شیطنت آدمی کی دیکھی — شیطان بھی آدمی ہو جیسے
باقی ہے ابھی عروجِ آدم — کچھ شئے ہے ڈھکی چھپی ہو جیسے
یوں تو نہیں کوئی زندگی میں — پھر بھی یہ گماں کوئی ہو جیسے
جی خوش ہوا نیک کام سے یوں — خلوت میں تری ہنسی ہو جیسے

شاذؔ اس سے مفر کہاں ہے ممکن
دنیا ہے، بُری بھلی ہو جیسے

☆☆

غزل

ملی ہے درد کی دولت سنبھال کر لے جا
یہ اس کے در کی عطا ہے تو اپنے گھر لے جا

اب آگیا ہے یہاں تک تو خالی ہاتھ نہ لَوٹ
مہ و ستارہ و خورشید و بحر و بَر لے جا

خیالِ نو کا کوئی بے ستوں تراش کے دیکھ
کوئی ایاغ تو اپنے لہو سے بھر لے جا

نہ سر جھکا مرے سنگِ اَنا سے ٹکرا کر
تو اپنے دستِ ندامت پہ اپنا سَر لے جا

گرہ بدوش ہے بازارِ مصر، رہنے دے
تو اپنے ساتھ زرِ ناخنِ ہنر لے جا

مری نظر سے ہے میری بلند پروازی
یقیں نہ آئے تو آ میرے بال و پَر لے جا

ہر اک گلاب میں کانٹوں کو دیکھنے والے
مرا گداز، مرا دل، مری نظر لے جا

سَفر دراز ہے، زادِ سفر یہی ہے شاذؔ
تو اپنے نقشِ قدم، اس کی رہگذر لے جا

☆☆

غزل

ہزار چاہا طبیعت مگر نہیں لگتی
کہاں ہو تم کہ مجھے کچھ خبر نہیں لگتی

وہ خواب دیکھا کہ تعبیر جس کی پا نہ سکے
وہ آنکھ پائی کہ جو رات بھر نہیں لگتی

یہ اور بات کہ بابِ اثر کھلے نہ کھلے
کوئی دُعا ہو مجھے بے اثر نہیں لگتی
حکایتِ غمِ جاں کیا سُنائیں دنیا کو
طویل تو نہیں پر مختصر نہیں لگتی

نگر نگر سے مرے واسطے تم آئے ہو
تمہارے چہرے پہ گردِ سفر نہیں لگتی

یہ اور بات کہ گھبرا کے آدمی مرجائے
مگر حیات کبھی دردِ سر نہیں لگتی

لگی ہے چوٹ تو اس کو سنبھال کر رکھنا
یہ چوٹ وہ ہے جو بارِ دگر نہیں لگتی

زہے وہ شاخ کہ جس کے تلے کوئی دم لے
وہ بے ثمر ہی سہی بے ثمر نہیں لگتی

وہ راستہ تو مہکتا ہے اس کی خوشبو سے
وہ کنج گل ہے مجھے رہ گذر نہیں لگتی

وہ پیاس کیا کہ فریب سَراب کھا نہ سکے
مجھے وہ پیاس تو کچھ معتبر نہیں لگتی

کہو حسینوں سے آ جائیں بے حجابانہ
مری نظر سے کسی کو نظر نہیں لگتی

ملا ہے خلعتِ دشنام شاذؔ کیا کیجئے
کلاہ پائی مگر زیبِ سر نہیں لگتی

☆☆

غزل

آنکھ ساقی کی بھر آئے دلِ ساغر بیٹھے
جب مرے بعد کوئی تیرے برابر بیٹھے

تہ نشینی و گہر چینی جنوں مانگے ہے
سوچتے رہ گئے ساحل پہ شناور بیٹھے

ایستادہ تھے جہاں صاحب دستار و کلاہ
تھے اُسی بزم میں ہم جیسے گداگر بیٹھے

ہم نے مر مر کے یہ اندازِ سخن پایا ہے
تم کو تو حسن مِلا ہے مری جاں گھر بیٹھے

سنگ کو سنگ نہ کہہ نجد کو صحرا نہ سمجھ
شاؔذ کا ٹھیک نہیں جانے یہ کیا کر بیٹھے

☆☆

غزل

کب رُت پھرے، کب گُل کھلیں، ہم کو پتہ کچھ بھی نہیں
یہ شہر کیسا شہر ہے آب و ہَوا کچھ بھی نہیں،

اپنا وجود اپنا عدم اک بند مٹھی کا بھرم،
مانا کہ ہے کچھ بھی نہیں، سچ ہے کہ تھا کچھ بھی نہیں

ہر لذّتِ دُنیا کو چکھ ہر سانس کو گن گن کے رکھ
سب جیتے جی کے ٹھاٹ ہیں، بعدِ فنا کچھ بھی نہیں

جب دل شگفتہ ہو میاں پھر لُطفِ بزمِ میکشاں
بوندیں پڑیں تو کیا ہوا کالی گھٹا کچھ بھی نہیں

تو کیا بھلا دیں سب مزے، جلسے، لطیفے، رت جگے
وعدے جو ایماں بن گئے آخر یہ کیا کچھ بھی نہیں

کل چاند اُترا میرے گھر، آزردہ رُو، باچشمِ تر
میں نے کہا کیا بات ہے، اس نے کہا کچھ بھی نہیں

جب حسن خود ہو منتظر اے شاؔذ کیوں تاخیر پھر
ناخن ہے پیچ و خم کشا، بندِ قبا کچھ بھی نہیں

☆☆

غزل

کوئی صبح تو مہکے جوُہی سی کوئی شام تو اترے گگن بن سے
کوئی آنچ تو دے قربت کی مجھے کوئی شعلہ تو اپنی دھنک تن سے

اک بدلی تو تھی بنجارن سی اک چاند تو تھا رَمتا جوگی
پھر بدلی نے چاند کو ڈھانپ لیا کیوں چاہا تھا ٹوٹ کے تن من سے

کبھی سوچا ہے کتنے جام پیے کبھی دیکھا ہے کتنے زخم سیے
کوئی مستی میں گنتی کیا کرتا یہی راز چھپا ہے سُمرن سے

کوئی یار تو ہو، مئے خوار تو ہو، کوئی پیار تو ہو، دلدار تو ہو،
کوئی جھونکا تو سنکے پھر سَن سے کوئی شیشہ تو ٹوٹے پھر چھن سے

یہ جو چمپئی، گندنی پھول سے ہیں نہیں تُو، تو یہ کتنے ملول سے ہیں
یہ جو اشرفیاں ہیں بکھری ہوئی اِنہیں رنگ ملا تری اُترن سے

خدا ترس

خدا ترس، رنگِ رُخ پریدہ
دہکتا چہرہ
شفق بھبھوکا
کرنجی آنکھیں
جگار سے سُرخ ہو رہی ہیں
غبارِ سُرمہ بکھر رہا ہے
جبیں پہ مُہرِ نشانِ سجدہ
سماع
کشف و کمال
دھمال
یاہُو
مُرید
حلقہ
تھرکتے بازو
لٹکتے گیسو
چمکتے ابرو
بلوریں تسبیح
دل کی مانند
لمحہ بھر کو رُکی نہیں ہے

وہ آگ پائی ہے ابتدا میں
کہ شعلے پہنچے ہیں انتہا تک
وضو تہجدّ سے ہے عشاء تک

○

نماز

روزہ
نفل

دُوگانے

زکوٰۃ

فطرہ

طوافِ کعبہ

وظائف

اوراد

چاشت
اشراق
اللہ اللہ

○

خُدا ترس، سر بہ خم، خمیدہ
ذریعۂ آب و ناں توکل
مگر تجارت سے ہے عقیدت

○

خدا ترس، نکتہ رس، رسیدہ
سنا ہلا یہ اُسے اشارہ
بہ صورت حرفِ استخارہ

تجارتِ قبر عینِ خدمت
نصیب کس کو ہے یہ سعادت
تو دفتر کاروبار کھولا
دِلوں کے پاتال میں اُتر کر
شکوک واوہام سے ٹٹولا

○

مزار
چادر
غلاف
لوبان
پھول
پنکھا
فلیتہ
نذرانہ
عود
دھونی
مکاشفہ
جھاڑ پھونک
چھوچھا
مجاوری
حاضرات
چلّہ
نیاز
تعویذ

اعتکاف

صدقہ

مناظرہ

وعظ

ذکرواذکار

عقد

باندی

کنیز

فتویٰ

نکاح مہرِ مُعجلّہ ہو

طلاق چَٹ سے

بیاہ پَٹ سے

کہ ہر قدم پر ہے خوانِ نعمت

ارے مناسب نہیں ہے غفلت

یہ زندگی چار دن کی فرصت

○

خُدا ترس، نفسِ خود گزیدہ

بچشمِ خُفتہ عبارتِ کفر کے نشے میں

مُرید سمجھے مراقبے میں

جلالِ قہر و غضب ہے رُخ پر

ہے ریش کیوں انگلیوں کی شانہ کشی سے ابتر

سمجھ کے ابلیس ہنس رہا ہے

کہ تنکا داڑھی کو ڈس رہا ہے

☆☆

غزل

بجھا نہ دے کہیں اے حُسنِ جوئے کم آبی
چراغِ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی

تمام قہر سخن دادِ ناشناسِ ہنر
ہماری آبرو اہلِ نظر کی کمیابی

خود اپنے آپ سے کھائی ہے میں نے زک اکثر
مری حریف رہی میری خوئے سرتابی

وہ قربتیں کہ تھیں بیتابیٔ سکوں جیسے
یہ دوریاں کہ مِلا ہے سکونِ بیتابی

نگاہ میں ہے یمِ زندگی کی گہرائی
مگر ہے پاؤں میں زنجیرِ موجِ پایابی

دھرا ہوا ہے مرا زادِ راہ بر لب جُو
وفورِ تشنہ دہانی دلیلِ غرقابی

شکن شکن مری کروٹ گواہ ہے اے شاذ
دِکھا گئی ہے کئی خواب میری بے خوابی

☆☆

غزل

اگر سوال وہ کرتا جواب کیا لیتا
یہ غم اُسی نے دیا تھا حساب کیا لیتا

بہت ہجوم تھا تعبیر کی دکانوں پر
ہمیں تھے ورنہ کوئی جنسِ خواب کیا لیتا

ہمارے عہد میں ارزانیٔ نقاب نہ پوچھ
میں کور چشموں کی خاطر نقاب کیا لیتا

فرات آج رواں ہے یزید پیاسا ہے
یہ پیاس کوئی بجھا کر ثواب کیا لیتا

ارے جسے ورقِ چہرہ چہرہ یاد ہو شاؔذ
بھلا وہ آدمی درسِ کتاب کیا لیتا

☆☆

غزل

شفق کی آنچ میں ہے اوس کی طراوت بھی
رُخِ شگفتہ کی تازہ دَمی و شادابی

شباب وہ کہ قباپشت کو ذرا نہ لگے
شکم کو چھو نہیں پائے لباسِ عنابی

ہے عکسِ وصل شلوکے سے چاندنی جیسا
بدن کی چھوٹ ہے یا چھوٹتی ہے مہتابی

تمام آگ چھلکتی ہے تیری نس نس سے
تمام پگھلی ہوئی بجلیوں کی سیمابی

یہ پَو کی آہٹیں یہ تیری خود نگہداری
یہ مری گمشدگی، صد ہزار بیتابی

کَسی کَسی ہوئی باہوں کی جلد مَسکی ہوئی
شِکن شکن ہے سراپا لباسِ شب خوابی

نہ پاسکا ہے کوئی سیر چشمیاں میری
نہ مِل سکی ہے سمندر کو تیری سَیرابی

☆☆

غزل

جس سے بیزار رہے تھے وہی در کیا کچھ ہے
گھر کی دُوری نے یہ سمجھایا کہ گھر کیا کچھ ہے

شکر کرتا ہوں خدا نے مجھے محسود کیا
اب میں سمجھا کہ مرے پاس ہنر کیا کچھ ہے

رات بھر جاگ کے کاٹے تو کوئی میری طرح
خود بخود سمجھے گا وہ پچھلا پہر کیا کچھ ہے

کوئی جھونکا نہیں سَدکا چمنِ رفتہ سے
کوئی سُن گُن نہیں یاروں کی خبر کیا کچھ ہے

نگراں سوئے زمیں دیدۂ افلاک ہے آج
جادۂ وقت پہ مٹی کا سفر کیا کچھ ہے

جیسے قسمت کی لکیروں پہ ہمیں چلنا ہے
کون سمجھے گا تیری راہگذر کیا کچھ ہے

ورقِ گل پہ ہے تحریر سی دونوں جانب
ہم نے کیا دیکھا اِدھر جانے اُدھر کیا کچھ ہے

چل پڑے صبحِ ازل شاذؔ اشارے پہ ترے
ہم نے سوچا ہی نہیں زحمتِ سفر کیا کچھ ہے

☆☆

غزل

الطافِ گریزاں ہو صنم اور زیادہ
اے آہوئے وحشت زدہ رم اور زیادہ

میں آج اگر خوش ہوں تو یہ تیرا ہی غم ہے
رونا تو بہرحال ہے کم اور زیادہ

بڑھتی گئی جس طرح تری مہر و مُروّت
حیران و پریشاں رہے ہم اور زیادہ

سرگوشی کی مانند نہ چل جادۂ دل پر
گہرے ہوں ترے نقشِ قدم اور زیادہ

آنکھیں تو تری خشک ہیں اے شاذؔ یہ کیا ہے
دامن ترا ہر روز ہے نم اور زیادہ

غزل

تنہائیوں کی دل شکنی چاہتا نہیں
گھر سے قدم نکالوں یہ جی چاہتا نہیں

ہنس ہنس کے میں نے آنکھ سے دریا بہا دیا
اب اس قدر بھی زندہ دلی چاہتا نہیں

چاہوں تو میرے پاس ہے ہر بات کا جواب
چاہوں گا ایک روز ابھی چاہتا نہیں

سچ بات پر تو دہر سے جھگڑا ضرور ہو
میں لاکھ چاہتا ہوں وہی چاہتا نہیں

گویا وہ شخص اپنے وطن میں ہے بے وطن
ہے دھوپ سر پہ، چھاؤں گھنی چاہتا نہیں

اپنے سوا کسی کا گذر ہی نہیں وہاں
وہ کون ہے جو تیری گلی چاہتا نہیں

سب کو یقیں ہے شاذؔ وہ جی سے اتر گیا
کیسے کہوں کہ ملنے کو جی چاہتا نہیں

☆☆

غزل

پھول کھلتے ہی ترا شعلۂ لب پوچھتے ہیں
وہی خوشبو، وہی جادو، وہی چھب پوچھتے ہیں

اپنی آنکھوں سے تو ٹوٹا ہی نہیں تار اب تک
تجھ پہ کیا گذری ہے اے سازِ طرب پوچھتے ہیں

حرم و دیر میں ہیں پوچھنے والے کیا کیا
حد یہ ہے عشق کا بھی نام و نسب پوچھتے ہیں

یوں تو ہر بات بھی پوچھی نہیں جاتی پھر بھی
کب انہیں پوچھنا تھا اور وہ کب پوچھتے ہیں

میکدہ والوں سے ملتے ہیں تو سب سے پہلے
اب بھی ہم خیریتِ بنتِ عنب پوچھتے ہیں

اس سے ملتے تھے تو یہ فکر کہ ملتے کیوں ہو
اب وہی لوگ نہ ملنے کا سبب پوچھتے ہیں

اِن سوالات کا سورج ہے سوا نیزے پر
شاذ وہ کیسا ہے! کب آئے گا؟ سب پوچھتے ہیں

☆☆

غزل

زادِ سفر کو چھوڑ کے تنہا نِکل گیا
میں کیا وطن سے نکلا کہ کانٹا نکل گیا

بہتر یہی تھا اپنی ہی چوکھٹ پہ روکتے
اب کیا پکارتے ہو جو نکلا نکل گیا

ہم چل پڑے کہ منزلِ جاناں قریب ہے
ستائے ایک لمحہ کو رستہ نکل گیا

کچھ لوگ تھے جو دشت کو آباد کر گئے
اک ہم ہیں جن کے ہاتھ سے صحرا نکل گیا

آنسو نکل نہ پائے نہ کچھ منہ سے کہہ سکے
وہ کیا گیا کہ شاذؔ کلیجہ نکل گیا

رقصِ ابلیس

اک اور رسم بھی چلی مذہب کے نام پر
ہوتا رہے فساد بھی تہوار کی طرح

پھولوں کے سائباں پہ ہو کافور کا دھواں
سر پر کفن ہو طرہ و دستار کی طرح

خوں کی لکیر مانگ کی سیندور میں رہے
کنگن بجیں تو تیغ کی جھنکار کی طرح

O

شہرِ خراب حال کے ملبہ پہ اہرمن
دامانِ عافیت کے پرخچے اُڑا گیا
تکمیلِ شر کے حکم کی تعمیل کی گئی
ہر بد نہاد بڑھ کے سر اپنا جھکا گیا

دیر و حرم کے طاق سے لے کر کتابِ خیر
رامائن و قرآں میں اضافہ کیا گیا

☆☆

سفید لہو

میں سوچتا ہوں

خدائے مطلق جو ہر جگہ ہے
وہ ہفت زینۂ فلک سے اُترے
زمیں پر آئے
وہ کور چشموں کو نور بخشے
کہ اُن کو معلوم ہو یہ نکتہ
کہ دین و مذہب سوائے الفت کے اور کیا ہے

○

میں سوچتا ہوں

کہ رام بن باس لیں دوبارہ
ہمارے شہر آئیں
کہ یہ بھی جنگل سے کم نہیں ہے
ذرا بتا دیں
کہ دھرم کے سامنے تو اوتار سر جھکا دیں

○

میں سوچتا ہوں

مسیح لوٹ آئیں آسماں سے
کہیں خداوند دو جہاں سے
مجھے زمیں پر اُتار دے تُو
صلیب پھر میری منتظر ہے

کہ سچ کے معنی بدل چکے ہیں
دلوں کے آتشکدے میں شاید
صحیفۂ نور جل چکے ہیں

○

میں سوچتا ہوں
زمیں کی آہ و بکا کو سُن کر
مہاتما بدھ کا گیان ٹوٹے
وہ آئیں اور آ کے پھر بتا دیں
کہ روحِ انساں جگائے رکھنا
ضمیر کی لو بڑھائے رکھنا
وفا کی شمعیں جلائے رکھنا

○

میں سوچتا ہوں
پیامِ حق لے کے آئیں نانک
ہماری، مٹی کا رنگ دیکھیں
ہمارے جینے کا ڈھنگ دیکھیں
سُنائیں پھر وہ کتھا سہانی
ہر ایک منزل وہی ہے لیکن
ہر ایک کا راستہ جدا ہے

○

میں سوچتا ہوں
حُسین آئیں
یہاں بھی ہے کربلا کا منظر
اِدھر بھی کوفہ بُلا رہا ہے

یہاں بھی نہرِ فرات (موسیٰ ندی ہے)
گلنار ہو رہی ہے۔
یزیدیوں سے حُسین کہہ دیں
سنو خدا سے یہ عہد و پیمانِ اوّلیں ہے۔
جھکے جو انسانیت کی چوکھٹ پہ وہ جبیں ہے
کسی سے بڑھ کر کسی سے کمتر کوئی نہیں ہے۔
وہ سب کا احوال جانتا ہے کہ وہ رگِ جاں سے
بھی قریں ہے

○

میں سوچتا ہوں۔
خدائے مطلق زمیں پہ اُترے گا
رام بن باس پھر سے لیں گے
مسیح دادِ صلیب دیں گے
مہاتما بدھ کا گیان ٹوٹے گا
نانک اٹھیں گے درس لے کر
حسین آئیں گے کربلا سے

○

میں سوچتا ہوں
کہ اس سے پہلے
کہ مرے خوابوں کے آئینہ میں
کوئی حسیں دن جھلک دکھائے
یہ رہنمایانِ عصرِ حاضر
کہ جن میں اکثر
ملے تہی سر

سراپا بد خواہ، زر گزیدہ
یہ دُزدِ سامانِ امن و راحت
ہر اک نصابِ دماغ پیچیدہ کر رہے ہیں
یہ سوچ کی کوکھ میں زہر بھر رہے ہیں
انہوں نے اپنی لُغت میں لکھا ہے
لفظِ مذہب —— بمعنی نفرت

☆☆

دو شعر

اُس قصرِ بدن کی چوکھٹ پر کیا کیف ملے ہے سجدوں میں
دستک دے سلیقہ سے تو کُھلے وا ہونے کا امکان باہوں میں

اُس خواب گہِ آفت کا چلن ترغیب ثوابِ تر دامن
چادر پہ شکن رفی عکسِ بدن جُوڑے کی خوشبو تکیوں میں

☆☆

غزل

جن زخموں پر تھا ناز ہمیں وہ زخم بھی بھرتے جاتے ہیں
سانسیں ہیں کہ گھٹتی جاتی ہیں دن ہیں کہ گذرتے جاتے ہیں

دیوار ہے گم صُم در تنہا پھر ہوتے چلے ہیں شجر تنہا
کچھ دُھوپ سی ڈھلتی جاتی ہے کچھ سائے اترتے جاتے ہیں

ہم یونہی نہیں ہیں سُست قدم ہم جانتے ہیں فردا کیا ہے
شاید کوئی دے آواز ہمیں رہ رہ کے ٹھہرتے جاتے ہیں

آواز وہ شیشۂ نازک ہے محرابِ نظر میں رہنے دے
کیوں فرشِ ساعت پر گر کر ریزے یہ بکھرتے جاتے ہیں

روئیں یا ہنسیں اِس حالت پر احساس یہ ہوتا ہے اکثر
وعدہ تو کسی سے شاذ نہ تھا ہم ہیں کہ مکرتے جاتے ہیں

اکائی

جب کوئی کانٹا چبھتا ہے
ہر اک کو چبھن دے جاتا ہے
جب سورج چرخ پر اگتا ہے
ہر گھر کو کرن دے جاتا ہے

جب کوئی پھول مہکتا ہے
گلشن میں ہو یا وہ جنگل میں
تب خوشبو پھیلتی جاتی ہے
جوڑے میں بَر میں آنچل میں

سُکھ بات سے سب خوش ہوتے ہیں
دُکھ بات سے سب دل روتے ہیں
جس وقت سفینے ڈوبتے ہیں
سب دریا ساحل روتے ہیں

ہر ایک شجر کا ہر پتّہ
اک دوسرے کا غم سہتا ہے
اک پھول کو توڑو شاخ کا دل
تھراتا ہے غمگین رہتا ہے

آتی ہے خزاں کی رُت جس دم
سب پتّے جھڑتے جاتے ہیں
جب فصلِ بہاراں آتی ہے
سب غنچے چمن مہکاتے ہیں

جب کوئی پرندہ دَم توڑے
تب سارے پرندے منڈلا کر

دیتے ہیں خراجِ بال و پر
روتے ہیں تڑپ کر چلّا کر

ہم لوگ تو آخر انساں ہیں
ان سب سے گئے گذرے تو نہیں

تسبیح کہ سُمرن دونوں کے
دانے ہیں وہی بکھرے تو نہیں

دُنیا ہے اکائی پر قائم
معلوم نہیں کیا شئے ہے دوئی

اک ڈور پرو لیتی ہے، ہمیں
ممکن ہی نہیں ہو غیر کوئی

تم گنگا جَل میں نہاتے ہو
میں ڈوبا آبِ کوثر میں

تم آؤ اذاں دو منبر سے
میں دیپ جلاؤں مندر میں

☆☆

غزل

وفا کا ذکر ہی کیا ہے جفا بھی راس آئے
وہ مُسکرائے تو جُرمِ خطا بھی راس آئے

وطن میں رہتے ہم یہ شرف ہی کیا کم ہے
یہ کیا ضرور کہ آب و ہوا بھی راس آئے

ہتھیلیاں ہیں تری لوحِ نُور کی مانند
خدا کرے تجھے رنگِ حنا بھی راس آئے

دوا تو خیر ہزاروں کو راس آئے گی
مزہ تو جینے کا جب ہے شِفا بھی راس آئے

تو پھر یہ آدمی خود کو خدا سمجھنے لگے
اگر یہ عمرِ گریزاں ذرا بھی راس آئے

اب اس قدر بھی نہ کر جستجوئے آبِ بقا
گلِ ہنر ہے تو بادِ فنا بھی راس آئے

یہ تیرا رنگِ سُخن تیرا بانکپن اے شاذ
کہ شِعر راس تو آئے انا بھی راس آئے

☆☆

غزل

سنبھلا نہیں دل تجھ سے بچھڑ کر کئی دن تک
میں آئینہ تھا بن گیا پتھر کئی دن تک

کیا چیز تھی ہم رکھ کے کہیں بھول گئے ہیں
وہ چیز کہ یاد آئی نہ اکثر کئی دِن تک

اَے شاخِ وفا پھر وہ پرندہ نہیں لوٹا
میں گھر میں تھا نکلا نہیں باہر کئی دن تک

وہ بوجھ کہ تھی جس سے مرے سر کی بلندی
وہ بوجھ گرا اُٹھ نہ سکا سَر کئی دن تک

ہم نے بھی بہت اُس کو بھلانے کی دعا کی
ہم نے بھی بہت دیکھا ہے رو کر کئی دن تک

کہتے ہیں کہ آئینہ بھی دیکھا نہیں اُس نے
سُنتے ہیں کہ پہنا نہیں زیور کئی دن تک

ہم تان کے سوئے تھے کہ کیوں آئے گا وہ شاذؔ
دیتا رہا دستک وہ برابر کئی دن تک

☆☆

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

آج کی رات بھی پھر سینۂ صد چاک میں درد
زخم بردوش، کفن باندھے ہوئے سر سے اُٹھا
روشنی کیسی ہے، شعلوں کی زبانیں کیسی،
یہ دُھواں دل سے اُٹھا ہے کہ کسی گھر سے اٹھا

○

گھر فقط گھر نہیں دیوار نہیں، بام نہیں
گھر تو تہذیب ہے، تاریخ کا آئینہ ہے
گھر تو اک سلسلۂ موج ہے سرشور و بلند
گھر تو اک عہد ہے اک نسل کا شیرازہ ہے
گھر تو اک بیج کی مانند ہے ہم مٹی ہیں
گھر تو چھتنار درختوں کا گھنا سایہ ہے
گھر تو اک باغ ہے ہم سب ہیں کلی سے گل تک
گھر تو اک خواب کی تعبیر ہے، اک وعدہ ہے

○

نہ کسی ناوکِ اغیار پہ یہ راز کھلا
نازِ شیشہ نہ کسی خوئے ستم گر سے اُٹھا
آج کی رات بھی پھر سینۂ صد چاک میں درد
زخم بردوش، کفن باندھے ہوئے سر سے اُٹھا
روشنی کیسی ہے، شعلوں کی زبانیں کیسی
یہ دھواں دل سے اٹھا ہے کہ کسی گھر سے اٹھا

☆☆

نذرِ اندرا گاندھی

قانون باغبانیٔ صحرا سکھائیں گے
تیرے لہو کے قطرے بہت کام آئیں گے

حیرت ہے تیرے پاؤں زمیں میں گڑے رہے
فرعون تخت پر تھا تو موسیٰ کھڑے رہے

شاخِ خمیدہ تن گئی تلوار ہو گئی
بد بینی مشتری کی خریدار ہو گئی

دیوار چُن گئی ہے دریچہ نہیں رہا
سمجھے تھے اپنا گھر جسے اپنا نہیں رہا

راون کو آج سیتاہرن پر غرور ہے
اے رام تیری بستی سے بن کتنی دور ہے

☆☆

آخرِ شب کے ہمسفر

(فیض کے انتقال پر)

ہم نے اُن پیڑوں کے سائے میں پناہیں ڈھونڈھیں
جن کے سائے تھے ہمیں چھوڑ کے جانے والے

سرکشیدہ بھی نہ تھے دیر شناسا بھی نہ تھے
کیا ملنسار تھے منھ موڑ کے جانے والے

○

آؤ پھر مرحلۂ رنج و محن سے گذریں
آؤ یکجا کریں، سلگائیں کرن کا ایندھن

شعر کی اوس کی مہکار کو کچھ تیز کریں
تر بہ تر نغموں سے ہے اُس کی چتا کا چندن

○

آؤ پھر نور کی ارتھی کو سمولیں دل میں
کوئی کانٹا کوئی نشتر سا چبھولیں دل میں

دل کے کیا زخم دکھائیں انہیں دھولیں دل میں
بارہا سوچا ہے پھر سوچ کے رولیں دل میں

○

ایک نسل آتی ہے اک نسل جُدا ہوتی ہے
رخصتِ عہد کا یہ زخم بہت گہرا ہے

قرضِ خوُں بَستہؑ رفتہ ہے کفِ قاتل پر
ہم کہ استادہ ہیں تاریخ کے اُس ساحل پر

شام کا وقت ہے دریائے ابد ٹھہرا ہے
ڈوبتے جاتے ہیں آ آ کے شناسا سورج
ہم بھی ڈوبے ہیں کہ ڈوبا نہیں تنہا سورج

☆☆